Regd. L. No.7243

Phone

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

جنوری 1984

اس پرچہ میں

(۱) قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی۔

(۲) میں نے (مرحوم) صدر ایوب سے کیا کہا تھا؟

شائع کردہ ادارۂ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدلِ اشتراک سالانہ	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
پاکستان /۴۸ روپے غیر ممالک /۹۸ روپے	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۴ چار روپے
جلد ۳۷	جنوری ۱۹۸۴ء	شمارہ ۱

فہرست

۱۔ لمعات (عید میلاد النبیؐ) — — — — — — — — — ۲

۲۔ باب المراسلات (۱) اسلام نہ کہیئے (۲) صرف کتاب اللہ — — — — ۴
(۳) اسلامی دستور کا انگلستانی خاکہ (۴) پہلا مارشل لاء ———

۳۔ تیصفے سے اُمت بیچاری کے دین بھی گیا، دنیا بھی گئی! — — — — — ۹
(بتقریب یوم پیدائش، قائداعظمؒ) محترم پرویز صاحب ———

۴۔ میں نے (مرحوم صدر) محمد ایوب خاں سے کیا کہا تھا؟ محترم پرویز صاحب ——— ۲۳

۵۔ قرآنی درس کے اعلانات — — — — — — — — — ۶۳

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت: ۲۵ بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور، مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۷ ایبک روڈ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۳۳/۵۶)

ربیع الاوّل کا مہینہ، نور و حکمت کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے، پھر سے، وجہِ شادابیٔ عالم ہوا۔ ۱۶ دسمبر کی صبح، اس مقدس اور بابرکت تقریب کو، حسبِ معمول ادارۂ طلوعِ اسلام کے سبزہ زار میں انتہائی خلوص اور سادگی کے ساتھ منایا گیا۔ پرویز صاحب کے قرآنی درسوں اور خطابوں نے اس قدر کشش اور جاذبیت حاصل کر لی ہے کہ شہر سے اسقدر فاصلہ کے باوجود، اربابِ ذوق، ان میں جوق در جوق شریک ہوتے ہیں۔ امسال اس تقریب پر ان کے درس کا موضوع تھا ـــــ اسلامی نظام قائم کرنے والے کیسے ہوتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ بعض سطحی بینوں اور حقیقت ناآشنا لوگ کہتے ہیں کہ نبی کی حیثیت (معاذ اللہ) ایک ڈاکیئے کی سی ہوتی ہے جس کا فریضہ اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ خدا کا پیغام دوسروں تک پہنچا دے۔ اور بس۔ انہوں نے کہا کہ ایسا سمجھنا نہ صرف جہالت ہے بلکہ گمراہی بھی ہے۔ نبی خدا سے وحی پاتا ہے (یعنی پاتا تھا۔ کیونکہ حضورؐ کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہو گیا) اور اس کے بعد (بحیثیت رسولؐ) وہ اس وحی کے مطابق، ایک معاشرہ، ایک نظام، ایک مملکت کی تشکیل کرتا تھا تاکہ اس میں قرآنی احکام و اقدار کو نافذ کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے رفقاء کی جماعت کی ضرورت ہوتی ہے جو اس فریضہ کی ادائیگی میں رسولؐ کی ممد و معاون بنتی ہے۔ رسولؐ ان افراد کو باہر سے "درآمد" نہیں کرتا۔ جو لوگ اس کے گرد و پیش بستے ہیں، انہی میں سے ایسے افراد تیار کرتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو رسولؐ کا اولین فریضہ "انسانیت سازی" ہوتا ہے۔ یہ فریضہ جس قدر اہم اور مشکل ہوتا ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جس معاشرہ میں نبی اکرمؐ کی بعثت ہوئی تھی، اسے قرآن (اور تاریخ) نے "عہدِ جاہلیہ" کہہ کر پکارا ہے جو ہر قسم کے عیوب و نقائص سے بھرپور تھا۔ اس قسم کے افراد کو ایسے انسان بنا دینا جن پر تاریخ ناز کرے، حضورؐ کا بہت بڑا معجزہ تھا۔ اس مقصد کے لئے، سب سے پہلے، حضورؐ کی فراست اس کا جائزہ لیتی تھی کہ اس معاشرہ میں وہ کونسے افراد ہیں، جن میں انسان بننے کی صلاحیت ہے۔ اس انتخابی نگاہ کی شہادت ہمیں حضورؐ کی اس دعا سے ملتی ہے جس میں آپؐ نے کہا تھا کہ:

یا الٰہ العٰلمین! اسلام کو ابوجہل یا عمر ابن الخطاب کے ذریعے تقویت بخش۔ ان دونوں

میں سے جو بھی کھنچے ہوئے مشرف بہ اسلام فرما! عمر ابن خطاب کے مقدر کا ستارہ چمکا اور اسکی صلاحیتوں کے فولادی ذرّے مقناطیسِ نبوتؐ سے ہمکنار ہوگئے۔ بارگاہ رسالتمآبؐ کی تعلیم و تربیت سے ان صلاحیتوں کو ایسی جلا ملی جس سے عمرؓ فاروقِ اعظمؓ بنکر آسمانِ انسانیت پہ مہرِ عالمتاب بنکر اس طرح چمکا کہ اس کی ضو فشانیاں وجۂ تابندگی عالم بن گئیں۔ ابو جہل اس سے محروم رہا تو جہالت کی زندگی جیا اور ذلّت کی موت مرا!

تربیت گاہ رسالتمآبؐ میں جس انداز کے انسان تعمیر ہوئے تھے، ان کی توصیف و ستائش سے قرآن کریم کے اوراق مزیّن و مرصّع ہیں۔ حضور نبی اکرمؐ کی شانِ اقدس میں ذاتِ باری تعالیٰ نے ان الفاظ میں تبریک و تحسین کے پھول نچھاور کئے تھے کہ

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ (۳۳/۵۶)

اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ بعینہٖ یہی الفاظ تربیت یافتگانِ نبوتؐ کے لئے آئے ہیں۔ فرمایا:

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ (۳۳/۴۳)

اے جماعت مومنین! خدا اور اس کے فرشتے تم پر درود و صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ ان کی رفاقت کی عظمت کے سلسلہ میں کہا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۸/۶۴)

اے نبیؐ! تیرے لئے خدا اور یہ مومن جو تیرا اتباع کرتے ہیں کافی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان سب کو مومن حقاً کہہ کر پکارا ہے۔ یہ تھی وہ جماعت مومنین جن کی رفاقت سے حضورؐ نے اسلامی نظام قائم کیا۔ یہ نظام، عہد فاروقیؓ میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا۔

اس کے بعد پرویز صاحب نے قرآنی نظام کے امتیازات اور خصائص ایسے مؤثر اور دلکش انداز میں بیان کئے کہ کبھی ان کی تابانیوں سے سامعین کے چہرے دمک اٹھتے تھے اور کبھی ان کی اثر انگیزیوں سے ان کی آنکھیں پرنم ہوجاتی تھیں۔ گیارہ بجے کے قریب یہ محفل برخاست ہوئی تو ایک نوجوان کو یہ کہتے سنا گیا کہ عید میلاد النبیؐ کے سلسلہ میں جتنا کچھ ہمارے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہوتا ہے اس کی جگہ یہ ایک خطاب نشر ہو جائے تو معاشرہ میں صحیح انقلاب برپا ہو جائے۔

ہمارے اس عزیز کو اس کا علم نہیں کہ ہمارے ذرائع ابلاغ سے اس قسم کے خطابات اسی لئے تو نشر نہیں کئے جاتے کہ معاشرہ میں صحیح انقلاب برپا نہ ہوجائے جسے دیکھ کر ہر لب گویا پکار اٹھے کہ:۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

باب المراسلات

اسلام نہ کہیئے

سوال :۔ آپ کہتے ہیں کہ اسلام میں سیاسی پارٹیاں بنانا جائز نہیں لیکن ملک میں جب سیاسی پارٹیوں کے مسئلہ پر گفتگو ہوتی ہے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے بغیر نظامِ حکومت چل نہیں سکتا۔ اس کا کیا جواب ہے؟

جواب :۔ ہم اس حقیقت کو متعدد بار واضح کر چکے ہیں کہ ہم جب کہتے ہیں کہ اسلام کی رُو سے فلاں بات جائز ہے اور فلاں ناجائز، تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جب نظامِ مملکت اسلامی ہو تو اس میں فلاں بات جائز ہوتی ہے اور فلاں ناجائز۔ جب مملکت اسلامی نہ ہو تو اس میں امورِ مملکت سے متعلق اسلام کے حوالے سے بات ہی نہیں کرنی چاہیئے۔ غیر اسلامی مملکت، سیکولر ہوتی ہے۔ اس میں سیکولرازم کے حوالے ہی سے معاملات کا تصفیہ ہونا چاہیئے۔ ہماری کیفیت یہ ہے کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں اگر کسی طرح اسلام سے اس کی تائید مل جاتی ہے تو اس کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں اور اسکے بعد اسے غیر اسلامی مملکت کے نظام میں فِٹ کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب وہ اس میں فِٹ نہیں بیٹھتی تو ہم اسلام پر الزام دھر دیتے ہیں (مثلاً) ہمارے ہاں نظامِ مملکت کا نقشہ مغرب کی سیکولر جمہوریت کا ہے جو سیاسی پارٹیوں کے بغیر چل نہیں سکتا اور نظری طور پر ہم یہ طے کر لیتے ہیں کہ اسلام میں پارٹیوں کی گنجائش نہیں۔ ہماری تمام الجھنوں کا باعث ہمارا یہی تضاد ہے۔ ہم نظام تو مغرب کا جمہوری چاہتے ہیں، لیکن چونکہ "پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا" اس لئے اس نظام کے گلے میں تعویذ، اسلام کے نام کا لٹکانا چاہتے ہیں تاکہ یہ شیطان کے شر سے محفوظ رہے۔

ہمارا آپ سے مشورہ یہ ہے کہ جب ہم کہیں کہ "اسلام کی رُو سے بات یوں ہے" تو آپ اسے اسطرح پڑھیے کہ "اسلامی مملکت میں یوں ہوگا"۔ مثلاً ہم نے لکھا

کہ اسلام میں سیاسی پارٹیوں (اور مذہبی فرقوں) کی اجازت نہیں، تو آپ یوں سمجھئے کہ ہم نے کہا ہے کہ "اسلامی مملکت میں سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقوں کا وجود نہیں ہوگا!" ہم آئندہ اسی انداز سے بات کریں گے تاکہ اس باب میں کوئی الجھاؤ نہ رہے۔

۲۔ صرف کتاب اللہ:

سوال: آپ مسلسل لکھتے چلے آرہے ہیں کہ ایک مملکت، اسلامی اس صورت میں بن سکتی ہے جب اس میں قانون سازی کی بنیاد کتاب اللہ پر ہو۔ میرا خیال ہے کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے بھی یہی کہا تھا۔ انہوں نے کتاب اور سنت کہیں نہیں کہا۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: یہ درست ہے۔ انہوں نے قانون سازی کے سلسلہ میں کتاب و سنت "کہیں نہیں کہا، صرف کتاب اللہ کہا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ کتاب و سنت کی رو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا جسے تمام فرقوں کے مسلمان اسلامی تسلیم کرلیں۔ علامہ اقبالؒ نے، اپنے خطبات (بالخصوص چھٹے خطبہ) میں اس موضوع پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی ضابطہ قوانین وہی مرتب کرسکے گا جو عمر فاروقؓ کی روح کو لئے ہوئے یہ کہے کہ حسبنا کتاب اللہ (ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے)۔ قائداعظمؒ نے بھی یہی کہا تھا کہ ہماری آزادی اور پابندی کی حدود خدا کی کتاب متعین کرتی ہے، اور اسلامی مملکت، کتاب اللہ کی حکمرانی کا دوسرا نام ہے۔ ان (دونوں) کی نگاہِ حقیقت بین اسلام اور زندگی کے حقائق پر تھی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کو بھی (بیس سال تک یہ اعلان کرتے رہنے کے بعد، کہ پاکستان میں قوانین، کتاب و سنت کے مطابق بننے چاہئیں) بالآخر یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کرلیں۔ لیکن ان کے پیشِ نظر، نظریہ ضرورت تھا، اس لئے انہوں نے، اس اعتراف کے باوجود مطالبہ یہی جاری رکھا کہ قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔ بلکہ یہ کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کردینی چاہیئے۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے جسے حق سمجھا اس پر قائم رہے اور آخر دم تک یہی کہتے رہے کہ قوانین سازی کا مدار کتاب اللہ پر ہونا چاہیئے۔ اور بس۔ ان کے نزدیک اتباعِ سنت نام تھا حضورؐ کی سیرت طیبہ (اسوۂ حسنہ) کی پیروی کا۔

۳۔ اسلامی دستور کا نیا خاکہ:

سوال:- حال ہی میں یورپ کی اسلامی کونسل کا مرتب کردہ اسلامی دستور کا ایک مسودہ (یا خاکہ) پاکستان آیا ہے جسے اسلام آباد میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں پیش کیا گیا ہے۔ (لاہور سے شائع ہونے والے روزنامہ جنگ کی ۱۰ دسمبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں کہا گیا تھا کہ اس مسودہ کو اس کانفرنس میں پیش کیا جائے گا) اس مسودہ دستور کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:- علامہ اقبالؒ نے مدت ہوئی کہا تھا کہ اگر ہماری حالت یہی رہی تو

آئیں گے غسّال کابل سے، کفن جاپان سے

انہیں معلوم نہیں تھا کہ (ان کے تصور کی اسلامی مملکت میں) اسلامی دستور تک انگلستان سے آیا کرے گا۔ ویسے یہ انداز ہماری ذہنیت کے عین مطابق ہے۔ ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم دیسی چیزوں کے مقابلہ میں ولائتی (یعنی دورِ حاضر کی اصطلاح میں، امپورٹڈ) چیزوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ پاکستان میں تیار شدہ ایک چیز کی قیمت دس روپے ہو تو ہم امپورٹڈ کا تقاضا کرتے ہیں اور اسے پچاس روپے میں خرید کر خوش ہوتے ہیں کہ سودا بہت سستا رہا۔ ہماری اس ذہنیت کے پیشِ نظر، ولائتی دستورِ اسلامی کو پاکستانی دستور پر یقیناً ترجیح ہونی چاہیئے۔

باقی رہی اس دستور کی کیفیت سو دستور کی اساسی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں قانون سازی کا معیار کیا قرار دیا گیا ہے۔ پاکستانی دستور میں کتاب وسنّت کو معیار قرار دیا گیا ہے جس کے متعلق نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے دیکھ لیا گیا ہے کہ پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ انگلستانی دستور میں کہا گیا ہے کہ:-

دفعہ (۱) الف۔ حاکمیت بلا شرکت غیرے اللہ تعالیٰ کی ہے اور مقتدرِ اعلیٰ شریعت ہے

(ب) شریعت قرآن وسنّت سے عبارت ہے اور قانون سازی اور طرزِ حکمرانی کا ماخذ ہے۔

ذرا غور کیجئے کہ یہ فارمولا کیا بنا؟ یہ کہ مقتدرِ اعلیٰ شریعت ہے اور شریعت عبارت ہے قرآن وسنّت سے۔ اس کے بعد مرتب کرائیے ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین اس فارمولے کی رو سے، جس کے عملی مفہوم پر بھی سب کا اتفاق نہیں ہوگا! یعنی اسی پہ اتفاق نہیں ہوگا کہ وہ شریعت کونسی ہے جو کتاب وسنّت سے عبارت ہے؟

یہ ہے اس برآمد شدہ دستوری خاکہ کی اساس! البتہ اس میں ایک اضافہ ہے، اور وہ یہ کہ سربراہِ مملکت کو امام کہا جائیگا جس کے ہاتھ پر مجلس بیعت کریگی۔ اسکے بعد اس کے اسلامی ہونے میں کیا شبہ رہ جائیگا؟

۴۔ پہلا مارشل لاء:

سوال: اخبارات میں مولانا محمد مالک کاندھلوی کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس کی رُو سے انہوں نے کہا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلا مارشل لاء حضرت صدیق اکبرؓ نے لگایا تھا۔ (بحوالہ ہفتہ وار حرمت۔ ۱ تا ۷ نومبر ۱۹۸۳ء) آپ بتائیں گے کہ یہ کہاں تک صحیح ہے۔

جواب: یہ بہت بڑا "انکشاف" ہے جو مولانا صاحب نے فرمایا ہے۔ تاریخ اسی طرح مسخ ہوا کرتی ہے! ہمارے دورِ ملوکیت میں ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ امام یوسفؒ نے اذان میں یہ اضافہ تجویز کیا تھا کہ "لِذا وقت الصلوٰۃ یا امیرالمومنین" (بحوالہ ہدایہ۔ باب الاذان) اور (اغلباً) شرح نخبتہ الفکر میں ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید کبوتر اڑا رہا تھا۔ قاضی یحیٰی بن اکثم نے دیکھا تو فرمایا کہ رسول اللہؐ بھی کبوتر اڑایا کرتے تھے۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام (یہ الگ بات ہے کہ اس وقت کے خلیفہ نے اذان کے اضافہ کو منع کر دیا تھا، اور اپنے کبوتروں کو ذبح)

وہ مردِ درویش!

پرویز صاحب کے حلقۂ فکر سے اچھے اچھے اہل علم اور اربابِ ذوق منسلک چلے آ رہے ہیں لیکن ان میں ایک ایسا مردِ درویش تھا جس کا اخلاص اور ستائش سے بے نیازی اپنی مثال آپ تھے منحنی سا دیہاتی، تہمد اور کرتے میں ملبوس، سر پہ کبھی دو پیچی کی پگڑی، ورنہ برہنہ سر محفل کے ایک گوشے میں خاموش بیٹھا رہتا لیکن جس مقام پہ اربابِ فکر ٹھک جاتے وہ سادہ سے الفاظ میں اسے حل کر کے پھر خاموش بیٹھ جاتا۔ ہماری تحریک کا انداز یہ ہے کہ رفقا کسی سکیم کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو باہمی عطیات سے اسے بروئے کار لانے کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں وہ پیکرِ استغنا، جیب میں ہاتھ ڈالتا اور جو کچھ اس سے نکلتا، خاموشی سے رفقار کے حوالے کر دیتا۔ ـــــــ اور وہ کسی اور سے کم نہ ہوتا۔ مفکرِ قرآن سے اسے والہانہ لگاؤ تھا اور وہ بھی اس سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ یہ تھے سید حسن کے سید امیر حسین شاہ جن کے متعلق، وہاں کی بزم کے نمائندہ، سید محمد حسین شاہ نے یہ جانکاہ خبر بھیجی کہ وہ مختصر سی علالت کے بعد، انتقال کر گئے ہیں۔ یہ خبر جس قدر اچانک تھی اسی قدر جگر خراش بھی تھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ آخری وقت میں جو چار پیسے ان کے پاس تھے، انہیں ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ اس آخری امانت کو باباجی تک پہنچا دیں کہ وہ جیسے مناسب سمجھیں صرف میں لائیں شمعِ قرآنی کے اس قسم کے پروانے اب کہاں ملیں گے؟ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان اور رفقائے تحریک کو صبرِ جمیل کی توفیق۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

سلیم کے نام

پرویز صاحب نے شروع ہی سے، اپنی قرآنی فکر و پیغام کا اوّلیں مخاطب، قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو قرار دیا ہے کیونکہ (بقول ان کے) اسی طبقہ کے بگڑنے سے قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے سنورتی۔ اس طبقہ کے قلب و دماغ میں صحیح انقلاب پیدا کرنے کے لئے انہوں نے ایک سنجیدہ، شگفتہ، دلآویز سلسلہ شروع کیا جسے "سلیم کے نام خطوط" سے تعبیر کیا گیا۔ ان خطوط نے فی الواقعہ قوم کے نوجوان طبقہ کی ذہنیت، بدل دی۔

پرویز صاحب، صاحب طرز فکر نگار ہیں۔ ان کی کسی تحریر کا کوئی ٹکڑا کہیں مل جائے، ان کے اندازِ نگارش سے واقف فوراً پہچان جائیں گے کہ یہ اُن کا قلم ہے۔ لیکن ان خطوط میں ان کا انداز بالکل مختلف ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے ایک مشفق باپ، اپنے ہونہار، عزیز بچوں سے باتیں کر رہا ہو۔ اسی لئے ان کے یہ خطوط نوجوان طالب علموں کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔

اس سلسلہ کی تین جلدیں ہیں،
جن کی قیمت حسب ذیل ہے:

- جلد اوّل ———— ۲۵/- روپے
- جلد دوم ———— ۲۵/- روپے
- جلد سوم ———— ۲۵/- روپے

(علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:

(۱) ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور ۱۱ (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

اے بادِ صبا! کملی والے سے، جا کہیو پیغام مرا

قبضے سے اُمّت بیچاری کے، دیں بھی گیا، دُنیا بھی گئی!

☆

(قائدِ اعظمؒ کے یومِ پیدائش ۱۹۸۳ء کی تقریب پر، پاکستان کی چھتیس سالہ تاریخ کا تجزیہ، جس سے یہ واضح ہے کہ دین تو یہاں نافذ ہی نہیں ہوا، اگر صورتِ حالات ایسی ہی رہی تو ملکی سالمیّت کے لئے بھی خطرہ نظر آتا ہے
——ایک دلِ دردمند کی فغاں!)

پرویز

باسمہٖ تعالےٰ

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا، طرزِ کلام اور ہے

قبضے سے اُمت بیچاری کے دین بھی گیا دنیا بھی گئی

اسلام کا منتہیٰ نوعِ انسان کے اختلافات مٹا کر انہیں عالمگیر برادری بنا دینا ہے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) اسی کا نصب العین ہے۔ حضورؐ کی مکی زندگی میں اسلام کے اس عالمگیر پروگرام کو اصولی طور پر عام کیا گیا۔ اسی لئے اُن آیات میں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھیں مخاطب النَّاسُ (یعنی نوعِ انسان) سے تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس عظیم اور وسعت نا آشنا پروگرام کا آغاز کسی ایک خطۂ زمین، اور کسی ایک جماعت سے ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے حضورؐ نے مکہ ہی میں ایک جدید اُمت کی تشکیل کی ابتداء کر دی۔ عرب کی آبادی مختلف قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی جن کا باہمی تعصب، بلکہ عداوت ضرب المثل تھی۔ یہ جدید اُمت انہی مختلف قبائل کے افراد پر مشتمل تھی۔ یہ افراد تمام سابقہ قبائلی نسبتوں کو معدوم و منسوخ کر کے، اس حصار میں داخل ہوتے تھے جہاں سب ایک ہی نام (مومن) سے پکارے جاتے، اور ایک ہی نسبت (اسلام) سے پہچانے جاتے تھے۔ قرنہا قرن سے ان قبائلی نسبتوں سے منسوب اور خونی رشتوں میں محدود افراد کو اس قسم کی اُمت بنا دینا جس میں خون، رنگ، زبان، نسل، قبیلہ، کی کوئی تفریق و تمیز نہ ہو، ایسا معجزانہ انقلاب تھا جس پر تاریخ کے محقق انگشت بدنداں ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اس وحدتِ اُمت کو شہد کے چھتے سے تشبیہ دی ہے۔ شہد کی مکھیاں مختلف پھولوں سے ایک ایک قطرہ شہد لا کر چھتے میں جمع کرتی ہیں۔ لیکن وہ قطرات اس میں اس طرح باہمدگر جذب ہو جاتے ہیں کہ یہ پہچانا ہی نہیں جا سکتا کہ کون سا قطرہ گلاب کے پھول کا ہے اور کون سا نرگس کے پھول کا ——— تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ یوں یہ تمام خارجی نسبتیں ایک وحدت" میں گم ہو جاتی تھیں۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ...... (۲/۱۴۳)" اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمت بنا دیا تاکہ تم نوعِ انسان کے اعمال کی نگرانی کا فریضہ ادا کرنے کے قابل ہو سکو۔ اسی کے لیے، قرآن کے الفاظ

میں، دنیا میں بادو ہی قومیں باقی رہ گئیں ـــــ یعنی ایک قوم یہ امت (جماعتِ مومنین) اور دوسری قوم، دنیا کے تمام وہ انسان جو اس نصب العین خداوندی (یعنی وحدتِ انسانیت) کی صداقت کو تسلیم نہ کریں (کافرین) (۲۴/۲۴) اس تشکیل و تفریق قومیت کے مطابق حبشہ کا بلالؓ، فارس کا سلمانؓ، اور روم کا صہیبؓ اپنی قوم (جماعتِ مومنین) کے افراد تھے اور مکہ کا ابوجہل اور (حضور کا حقیقی) چچا ابولہب، غیر قوم کے افراد۔ اسطرح یہ امت (امتِ مسلمہ) رنگ، نسل، زبان، وطن کی حدود و قیود سے بالا، صرف ایمان کے اشتراک کی بناء پر، ایک قوم (امتِ واحدہ) بنی تھی۔

ان میں کسی قسم کے اختلاف اور تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اختلاف کو قرآن نے خدا کا عذاب اور تفرقہ کو (خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو) شرک قرار دیا تھا۔ ان میں نہ مذہبی فرقے تھے نہ سیاسی پارٹیاں۔ اسلام ان سب کا دین تھا جس کا مرکز قرآن تھا، اور دین ہی ان سب کی سیاست تھی جس میں مختلف پارٹیوں کا تصور ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک امت۔ اس کا ایک ضابطۂ قوانین (قرآن)، ایک نصب العین حیات (تمکن اور استحکام نظامِ خداوندی)۔ اور وہ سب بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۸/۷۲) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز۔ جہاں تک مذہبی فرقوں کا تعلق ہے دین میں ان کا وجود ہی شرک ہے اس لئے امت واحدہ میں ان کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس قسم کا فرقہ پیدا کرنے کے لئے منافقین نے مدینہ میں ایک مسجد بنائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ مسجد نہیں، کفر کی علامت ہے۔ خدا اور رسول کے دشمنوں کی کمین گاہ ہے، دین کیلئے باعثِ ضرر ہے۔ یہ ایسی کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب ہے۔ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ (۹/۱۰۷)۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہا کہ اس مسجد میں قدم تک نہ رکھنا اور تاریخ بتاتی ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ کو ساتھ لے کر اسے مسمار کر دیا۔ یہ تھی اسلام میں مذہبی فرقہ بندی کی کیفیت!

امتِ واحدہ:

قبائلی امتیازات اور نسلی تفرقات کو اس حد تک ملیامیٹ کر دیا کہ حضورؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ "میں نے زمانۂ جاہلیہ کے تمام باطل عقائد اور مسالک کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔ وہ سب ملیامیٹ ہو گئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا بت نسلی تفاخر کا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ یاد رکھو، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں بجز تقویٰ"

ایک دفعہ دورِ فاروقی میں آلِ خبّہ کے ایک آدمی نے کسی معاملہ میں، اپنے امیر کی طرف رجوع کرنے کے بجائے اپنے قبیلہ کو امداد کے لئے آواز دی۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو لکھا کہ یاد رکھو! جب کوئی شخص اپنے قبیلے کو آواز دے تو سمجھ لو کہ

وہ شیطان کی آواز ہے۔ اس سے عہدِ جاہلیت کی قبائلی عصبیت جسے اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا،
پھر سے بیدار ہو جائیگی۔ اس رجحان کو سختی سے روکو۔ (شاہکارِ رسالت صفحہ ۲۸۹)
اس طرح اسلام نے ایک ایسی امت کی تشکیل کی جس میں کوئی اختلاف اور افتراق نہیں تھا۔

مختلف قومیں:

صدرِ اوّل کے بعد، جب دین مذہب میں تبدیل ہوگیا تو اس کے دیگر بنیادی اصولوں کیطرح وحدتِ امت کا نظریہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ یہ کسطرح ہوا ہیں اسوقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا لیکن ہوا یہ کہ ——— اُمتے بُودی اُمم گردیدہ ——— یہ امت نسل اور وطن کی تفریقات سے مختلف قوموں میں بٹ گئی اور مذہبی اختلافات سے مختلف فرقوں میں تقسیم ہوگئی۔ اقوامِ مغرب کی تقلید میں امت نے جغرافیائی حدود میں گھر کر مختلف مملکتیں بنائیں اور اپنی مملکتوں کی نسبت سے مختلف قومیتیں وجود میں آگئیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ جو کچھ نیشنلزم نے اقوامِ مغرب کے ساتھ کیا، وہی کچھ ان کے ساتھ ہوا۔ مسلمان کہلانے کے باوجود، ایک مملکت دوسری مملکت کی دشمن اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی۔ ان میں "مسلمان" نام کے سوا کوئی قدرِ مشترک نہ رہی۔

اقبال کا پیغام:

صدیوں سے ہماری یہی حالت چلی آرہی تھی کہ مبداء فیض کی کرم گستری سے ہم میں اقبال جیسا دیدہ ور پیدا ہوگیا۔ اس نے مسلم اقوام کو للکارا اور کہا کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی	تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہوجا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے	تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہوجا

اس نے ان سے کہا کہ:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے	نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر

یاد رکھو:

جو کریگا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا	ترک خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی	اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہگذر

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس عالمگیر امت کی تشکیل کے پروگرام کا آغاز ایک خطۂ زمین سے کیا گیا تھا۔ یہی اقبال نے سوچا اور اس پروگرام کی ابتداء کے لئے ہندوستان کے ایک ٹکڑے کو اپنا ہدف بنایا۔ اس نے اس کے لئے دو بنیادی اصولوں کا اعلان کیا۔ ایک یہ کہ ہندوستان کے مسلم اور غیر مسلم باشندے

اشتراکِ وطن کی بناء پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ مسلمان اشتراکِ دین کی بنیاد پر تمام غیر مسلموں سے الگ اور منفرد قوم ہیں۔

ہ نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بناء ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے۔

اور دوسرے یہ کہ اسلام دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب نہیں جس پر ہر قسم کی حکومت میں عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک دین ہے جس پر صرف اپنی آزاد حکومت میں عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے اس نے مطالبہ کیا کہ ہندوستان سے ایک خطۂ زمین الگ کر دیا جائے تاکہ اس میں اسلامی حکومت قائم کی جا سکے۔ قائد اعظمؒ نے اس مطالبہ کے حصول کے لئے جدوجہد شروع کی، اس مطالبہ میں ایسی جاذبیت اور ان زعمار ملت کے خلوص اور ایثار میں ایسی کشش تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے، ساری قوم، اپنے تمام اختلافات اور افتراقات کو بالائے طاق رکھ کر اس مطالبہ کے حصول کے لئے چٹان کی طرح متحد اور مستحکم ہو گئی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ چند سالوں کی مختصر سی مدت میں اس مقصد کے لئے ایک خطۂ زمین حاصل ہو گیا۔ واضح رہے کہ کوئی خطۂ زمین نہ از خود مسلم ہوتا ہے نہ کافر اس میں جس قسم کا نظام قائم کر دیا جائے وہ اسی قسم کا بن جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہمیں اسلامی مملکت حاصل نہیں ہو گئی تھی۔ اسلامی مملکت قائم کرنے کے لئے صرف ایک خطۂ زمین حاصل ہوا تھا۔ اور (جیسا کہ شروع میں دیکھا جا چکا ہے) اسلامی مملکت قائم کرنے کے لئے امتِ واحدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی ایک ایسی قوم جس میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہو۔ افتراق نہ ہو۔ جس کا ضابطۂ قوانین ایک ہو۔ نصب العین حیات اور مقصود و مطلوب زندگی ایک ہو۔ جس میں نہ نسلی امتیازات ہوں نہ جغرافیائی تفریقات۔ جس میں نہ مذہبی فرقے ہوں نہ سیاسی پارٹیاں۔

تشتت کا آغاز:

قوم نے مطالبۂ پاکستان کے لئے جس اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا، اس سے ہم نے غلطی سے سمجھ لیا کہ قوم امتِ واحدہ بن چکی ہے۔ ہمیں اس غلط فہمی یا خوش فہمی کا احساس، تشکیل پاکستان کے جلد ہی بعد ہو گیا۔ ابتداء ۱۹۴۸ء میں، مشرقی پاکستان میں زبان کے مسئلہ کی آڑ میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں میں فسادات شروع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ خود قائد اعظمؒ کو وہاں جانا پڑا۔ وہ وہاں قریب تین دن ٹھہرے واپسی پر انہوں نے، وہاں کے باشندوں کے نام ریڈیو سے ایک الوداعی پیغام نشر کیا جس کے دوران فرمایا:

پاکستان، مسلم قومیت کی وحدت کا مظہر ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہیئے۔ ہمیں حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس وحدت کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے۔ اگر ہم نے اپنے آپ کو اوّلاً بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ کی حیثیت سے سمجھنا شروع کر دیا، اور مسلمان اور

پاکستانی ہونیکی حیثیت محض اتفاقیہ تصور کر لی گئی تو پھر پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہ کوئی بعید از قیاس اور ناقابلِ فہم سا مسئلہ ہے۔ ہمارے دشمنوں کو اس کے امکان کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ اور انہوں نے ابھی سے اس کے لئے بساط بچھانی شروع کر دی ہے۔ میں آپ سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا سوچئے کہ جب سیاسی ایجنسیاں اور ہندو پریس جس نے تشکیلِ پاکستان کی انتہائی مخالفت کی تھی، مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے مزعومہ "منصفانہ حقوق" کا درد دل میں لے کر اٹھیں، تو کیا یہ ایک انتہائی شر انگیز چال نہیں ہوگی۔ کیا اس سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے نہیں آجاتی کہ یہ عناصر تخلیقِ پاکستان کی مہم میں ناکام رہ گئے تو اب انہوں نے اس کے اندر انتشار پیدا کر کے اِسے ختم کرنے کی ٹھان لی ہے اور اس کے لئے ایسا شر انگیز پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے، جس سے ایک مسلمان بھائی دوسرے بھائی کے خلاف لڑنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

سندھ کے کوائف:

آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آج کل سندھ میں جو کچھ ہو رہا ہے، میں اس کے متعلق سیاسی نقطۂ نگاہ سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ جو کچھ میں ابھی عرض کروں گا اس سے مقصد صرف یہ ہے کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں صوبائی عصبیت کے آثار ابتداء ہی سے نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے، جن کی طرف طلوعِ اسلام، اربابِ حل و عقد کی توجہ سامنے کے ساتھ منعطف کراتا چلا گیا۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اسے وہ اہمیت نہ دی جس کا یہ مسئلہ مستحق تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو گیا، اور مغربی پاکستان خلفشار اور انتشار کا ہدف بن گیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد طلوعِ اسلام کا دفتر کراچی میں قائم ہوا جس سے ہم اس قابل ہو گئے کہ ان علاقوں کے حالات کا بچشمِ خود مطالعہ کر سکیں۔ پاکستان میں طلوعِ اسلام کا پہلا پرچہ جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء کا مشترکہ نمبر تھا۔ اس میں اس نے جو کچھ لکھا تھا وہ ہر چشمِ بصیرت کیلئے سامانِ صد موعظت اپنے اندر رکھتا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"پاکستان کے مسلمانوں میں صوبائی تعصب اس قدر شدید ہے کہ اس کا احساس ہر قلب دردآگیں کے لئے درجۂ ہزار اضطراب ہے۔ یوں تو یہ تعصب کم وبیش ہر جگہ موجود ہے لیکن یہ اپنی انتہا کو سندھ میں آ پہنچا ہے۔ ہم سنا کرتے تھے کہ سندھ کا مسلمان، عام طور پر غیر سندھی مسلمان کے مقابلہ میں، سندھی غیر مسلم کو اپنے زیادہ قریب سمجھتا ہے۔ ہم ایسا سنتے تھے لیکن اسے باور کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن یہاں آکر جو دیکھا تو دیدہ شنیدہ سے کہیں بڑھ کر نکلی۔ تقسیم ہند کے بعد، مرکزی حکومت پاکستان کے دارالخلافہ کا مسئلہ مختلف صوبوں کے لئے وجۂ جاذبیت بن رہا تھا۔ ہر صوبہ اپنے اپنے استحقاق کی تائید میں دلائل وشواہد پیش کر رہا تھا اور انتظار میں تھا کہ دیکھیں کہ یہ سعادت عظمیٰ کس صوبہ کے حصے میں آتی ہے۔ ہمارے انتظار وترقب کا یہ زمانہ ختم ہوا اور اس مقصد کے لئے مرکزی حکومت کی نگہ انتخاب کراچی پہ آکر ٹھہری۔ اس انتخاب کی بنا پر غیر سندھی مسلمانوں کو کراچی میں آنا پڑا۔ اس کے بعد مشرقی پنجاب اور دہلی وغیرہ کے حوادث نے اس سلسلۂ درآمد کو اور تیز کر دیا۔

ہم سمجھتے تھے کہ سندھ کے مسلمان اس شرف واعزاز پر مسرتوں کے جھولے جھول رہے ہوں گے لیکن یہاں پہنچ کر ایسا معلوم ہوا کہ یہ کچھ انہیں بالعموم سخت گراں گذر رہا ہے۔ ہم محوِ حیرت تھے کہ یا اللہ! باہر سے آنے والے مسلمانوں کی کس بات سے انہیں اسقدر قلبی اذیت پہنچ رہی ہے۔ غور سے دیکھا تو اس کی وجہ بجز "سندھی اور غیر سندھی" کی اس تفریق کے۔ جو ان کے تحت الشعور میں انگڑائیاں لیتی رہتی ہے اور کچھ نہ تھی۔ اس کے بعد اس مغایرت وتفریق کے مظاہرے قدم قدم پہ دکھائی دینے لگے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں اور دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتے ہیں کہ بارالہا! یہ وہ سرزمین ہے جہاں کفر زارِ ہند میں سب سے پہلے اسلام کے قدوم برکات لزوم آئے اور یہیں آج یہ حالت ہے کہ عہدِ جاہلیت کی یہ عصبیت اس درجہ شدید ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ "سندھی اور غیر سندھی" کی تمیز بالآخر ہے کیا؟ انگریزوں نے انتظامی مصالح کی خاطر ملک کو مختلف خطوں میں تقسیم کیا۔ اب سوچئے کہ اسلام کی اس عالمگیر برادری میں جہاں حدود وقیود کو کہیں بار نہیں، بھلا یہ تقسیمی خطوط بھی کچھ حیثیت رکھتے ہیں! لیکن ہماری بدبختیوں کا کیا علاج! مسلمانوں کی زندگی کے تو ہر شعبہ میں عہدِ جاہلیت کے آثار ومظاہر سرایت کر چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خود سندھی مسلمانوں میں ایسے بالغ نظر افراد موجود ہیں جن کی نگاہیں اسلام کی قیود نا آشنا مواخات ومساوات کو خوب پہچانتی ہیں اور ان کی وسعت قلب سندھی و غیر سندھی کی تنگنائے عصبیت کی حدود میں مقید نہیں لیکن ایسے حضرات کا وجود خال خال ہے۔ یہاں کی اکثریت اسی جہالت کا شکار ہے جو ہمارے لئے باعث ہزار تاسف ہے"۔

سندھی مسلمانوں سے گذارش: طلوعِ اسلام نے اپنے سندھی بھائیوں سے گذارش

کرتے ہوئے لکھا ہے

(۱) ہم ——— سندھی مسلمانوں سے گذارش کریں گے کہ سندھی اور غیر سندھی کی تفریق یکسر غیر اسلامی ہے اس لئے وہ جتنی جلدی اس عصبیت کو اپنے دل سے الگ کر دیں اتنی ہی جلدی وہ حقیقی اسلام سے قریب آ جائیں گے ۔

(۲) غیر سندھی مسلمانوں سے گذارش کریں گے کہ وہ اپنے سلوک اور مروّت واخلاق سے ایسی کشادہ نگہی اور وسیع القلبی کا ثبوت دیں کہ سندھ کا مسلمان انہیں اپنا سمجھنے پر مجبور ہو جائے

(۳) حکومتِ سندھ کے اربابِ لبست وکشاد سے عرض کریں گے کہ وہ دورانِ نظم ونسق کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے دیں جس سے ذرا بھی مترشح ہو سکے کہ یہاں سندھی اور غیر سندھی کی تمیز کی جاتی ہے ۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں خطرہ ہے کہ "سندھی اور غیر سندھی" کی جو خلیج اس وقت قلوب کی دنیا میں حائل ہو رہی ہے روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے گی اور یہ انتشار ایک ازمصیبت کا موجب بن جائے گا ۔

اس باب میں قائدِ اعظمؒ کے ارشادات ہر پاکستانی کے لئے ہر وقت تنبیہہ وتنذیر کا حکم رکھتے ہیں جو انہوں نے یوم عید میلاد النبیؐ کے ایک اجتماع میں کراچی میں ارزانی فرمائے

"میں چاہتا ہوں کہ مسلمان صوبائی تعصب کے اس مرض کو دل سے دور کر دیں ، یہ امر اس برصغیر کے مسلمانوں کے لئے باعثِ لعنت ہے کہ ان کا ذہن ابھی تک سندھی ، پنجابی پٹھان اور دہلوی کے "تنگ دائروں میں گھوم رہا ہے"۔

(ڈان ۲۶/۱/۴۸)

خدا کرے جلد وہ دن آ جائیں کہ ہمارے سندھی بھائی ، باہر سے آنے والے غیر سندھی مسلمانوں کو اپنے دل کا ٹکڑا سمجھیں اور غیر سندھی مسلمان یہاں کے مسلمانوں کو اپنا بھائی تصور کریں اور ان دونوں کی باہمی مواخات و محبت سے ، پھر سے ان شرمندگانِ ساحل کے اچھل کر ہمکنار ہو جانے کا وہ نظارہ وجۂ شادابیٔ قلب ونگاہ ہو جائے جسے دیکھنے کے لئے ہر دیدۂ حساس مضطرب وبیتاب ہے ۔

بنگالی نئی نسل کا نمونہ :

ہم نے اربابِ اقتدار کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ قوم میں وحدت پیدا کرنے کا اوّلیں طریق یہ ہے کہ اس کے نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلی کی جائے۔ مشرقی پاکستان میں اس کی ضرورت اور بھی زیادہ شدید اس لئے تھی کہ وہاں ہندو کثرت سے آباد تھے اور مسلمان آبادی ان کے زیرِ اثر تھی۔ زندگی کے دیگر شعبوں سے قطع نظر، وہاں کا نظامِ تعلیم بھی ہندوؤں کی تحویل میں تھا، یہاں تک کہ وہاں اسلامیات بھی ہندو اساتذہ پڑھاتے تھے۔ ہم نے ذمہ دار ارکانِ مملکت سے کہا کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو وہاں کی نوجوان نسل، پاکستان ہی سے نہیں خود اسلام سے برگشتہ ہو جائے گی ـــــ لیکن فقیر کی اس صدا پر کسی نے کان نہ دھرا۔ اس سے وہاں کس قسم کی نسل پروان چڑھی۔ اس کا اندازہ اس ایک خط سے لگ سکتا ہے جو ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے فائنل کے ایک طالب علم، عزیز الرحمٰن نے وہیں کے ایک اخبار (DAINIC-PAKISTAN) کی اشاعت بابت ۷ مئی ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا۔ اس خط کا اردو ترجمہ حسبِ ذیل ہے:-

۱۹۴۷ء میں، تشکیلِ پاکستان کے ساتھ مغربی پاکستان کی طرف سے جو لہر ہماری طرف آئی تو اس سے ہم نے اپنے بنگالی تشخص کو فراموش کر دیا۔ پنجابیوں، سندھیوں اور بہاریوں کے ساتھ خلا ملا کی وجہ سے ہم اس قدر بے وقوف بن گئے کہ ہم نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ ہم اوّلاً مسلمان ہیں اور اس کے بعد بنگالی، بہاری، پنجابی وغیرہ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سامراج ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ (جس کے نتیجہ میں پاکستان، بھارت سے علیحدہ ہو گیا تھا) لیکن آج ہمیں قدرے اطمینان کا سانس لینا چاہیئے کہ مختلف اداروں کی کوشش سے خوابیدہ بنگالیوں میں حرکت کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ ہم شری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بجائے سنگھ جیسے اپنے توحی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد، طارق موسےٰ اور (معاذ اللہ) علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے میں فخر محسوس کرنے لگ گئے تھے۔ ہم اپنے بچوں کا نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں لکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ہم نے اپنے دلیس کے بھگوان کو بھلا دیا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا ـــــ اللہ ـــــ کو اپنا معبود تصوّر کر لیا تھا۔ ہم رام اور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے تھے اور ناگن کھاگن جیسے سیدھے سادے ناموں کو تیاگ بیٹھے تھے۔ یہ سب ان رنگین چشموں کا نتیجہ ہے جسے باہر سے درآمد کیا گیا ہے۔۔ لیکن اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ اس

سے اسلامی قومیت کے بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مشرقی بنگال کی اس روش کے تتبع میں مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں، اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔ اگر ہم اسی طریق سے اپنے دیگر اہلِ وطن کے خیالات کو بھی متاثر کرتے رہے کہ وہ جغرافیائی اور لسانی قومیت کو اسلامی قومیت پر ترجیح دیں تو مغرب کی عیسائی قوموں نے ترکوں کی خلافت کو تباہ کر کے جو کچھ حاصل کیا تھا، ہم اس سے بھی زیادہ حاصل کر لیں گے۔ (طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۱ء ص۱)

یہ خط وہاں کی نوجوان نئی نسل کے جذبات کا ترجمان تھا۔

کیا اس کے بعد بھی، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مشرقی پاکستان ہم سے الگ کیوں ہوا، کسی کمیشن کے بٹھانے کی ضرورت تھی؟

سندھ کی نئی نسل

مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا، وہ ہو گیا۔ اب یہ دیکھئے کہ اِدھر کیا ہوا! ہم نے دیکھا ہے کہ عزیز الرحمٰن نے اپنے خط میں کہا تھا کہ "ان کی روش کے اتباع میں، سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں"۔ انکی بیداری کے آثار کیا تھے اس کا اندازہ ایک سندھی طالبہ مس نسیم تھل کے اس خط سے لگائیے جو کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ حریت کی ہفتہ وار اشاعت بابت ۴ نومبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا:

> وہ اسلام اور پاکستان، جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں، سندھ موہنجو ڈارو، کوٹ ڈی جان کے آثارِ قدیمہ، اور لطیف، سچل، ایاز، جی ایم سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے (نہ کہ اسلام کی وجہ سے)
>
> (طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۶۸ء)

اور آگے بڑھئے۔ مشرقی پاکستان کے سنہ ۱۹۷۱ء کے المیے کے بعد اور اس قیامتِ صغریٰ کے پیشِ نظر جو وہاں کے "بہاری" (یعنی غیر بنگالی) مسلمانوں پر گزری، سندھ کی ایک اور بیٹی ــــ غزالہ بلوچ کا ایک خط اخبار "ڈیلی نیوز" کراچی کی ۱۹ اگست ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا

جس میں اس نے لکھا تھا :-

اگر مشرقی پاکستان کے بہاری، پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی پُرمسرت حالت میں ہوتے، لیکن انہوں نے سخت حماقت کی اور "پاکستان، ایک پاکستان" کے ساتھ وفاداری پر اصرار کرتے رہے اور اب اپنی حماقت کی قیمت اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔ بہاریوں کی بدقسمتی دراصل اُس دن شروع ہوتی ہے جب انہوں نے ۴۷ — ۱۹۴۶ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو وہ آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گذار رہے ہوتے، ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر، ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے، تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں رہنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں، یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں گے۔

(طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء صـ۴۳)

جی ایم سیّد :

یہ ہے وہ نئی نسل جسے ہماری مجرمانہ تغافل شعاری نے تیار کیا ہے۔ وہاں کے نوجوان طبقہ میں یہ ذہنیت ازخود پیدا نہیں ہوگئی۔ وہاں کے بزرگ سیاستدانوں نے جب اپنا قبلہ بدلا، تو ان کے مقتدیوں کے رُخ خود بخود بدل گئے۔ سندھ کی بزرگ ترین سیاسی شخصیت، مسٹر جی ایم سیّد کی ہے، —— وہی مسٹر سیّد جنہوں نے سب سے پہلے سندھ میں مسلم لیگ کو متعارف کرایا تھا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد ان میں ایسی تبدیلی آئی کہ جب اوائل ۱۹۷۲ء میں اُن کی سالگرہ منائی گئی تو اس تقریب پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ :-

پاکستان کے موجودہ انتشار، افراتفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے۔ یعنی دو قومی نظریہ، مذہبی نظامِ حکومت کا تخیل، فطائی نظریہ سیاست اور پڑوسی ملکوں سے دشمنی۔

اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا :-

۲۴ سالہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے دو قومی نظریہ کو خیرباد کہا جائے۔

یا پاکستان میں پانچ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور بنگال کی آزادی کے بعد مغربی پاکستان کی چار قوموں کو ملکی خود مختاری دے کر ان کے باہمی سمجھوتے سے ایک فیڈریشن بنائی جائے۔ (طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۸۱ء صفحہ ۵۲)

مارچ ۱۹۷۳ء کا ذکر ہے، سندھ یونیورسٹی نے "سندھی شام" کے عنوان سے ایک تقریب منائی اس میں تقریر کرتے ہوئے، مسٹر سید نے اپنے نظریات ایک ایک کر کے بیان کئے تھے؛ انہوں نے کہا تھا کہ سندھی قوم پرستی کے بنیادی اجزاء حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) سندھ کے جداگانہ ملک ہونے میں یقین رکھنا۔

(۲) پاکستان ایک ملک نہیں بلکہ چار جداگانہ ملکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں یقین رکھنا۔

(۳) سندھی، وطن، زبان، کلچر، تاریخی روایات، سیاسی اور اقتصادی مفاد کی بنیادوں پر جداگانہ قوم ہے۔

(۴) سندھی قوم جداگانہ حیثیت میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق انہوں نے کہا کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ "جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو بے وقوف ہیں یا دھوکہ باز" اس کے بعد انہوں نے کہا کہ سندھیوں کے پاس ہر آنے والی حکومت کی پالیسی کو جانچنے کے لئے کچھ معیار ہونے چاہئیں، جن کے مطابق غلط اور صحیح ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔ میری نظر میں وہ معیار یہ ہیں:۔

(۱) نظریۂ پاکستان میں اعتقاد رکھنے والی حکومت سندھیوں کو کبھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

(۲) مضبوط مرکز میں اعتماد رکھنے والی حکومت سندھ کی دشمن ہے۔

(۳) اسلامی آئین یا اسلامی حکومت پہ یقین رکھنے والی حکومت سندھ کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔

(۴) سندھیوں کی جداگانہ قوم اور سندھو دیش سے انکار کرنے والی حکومت سندھ دشمن شمار کی جا سکتی ہے۔

(طلوعِ اسلام۔ جون ۱۹۷۳ء)

انہوں نے واضح تر الفاظ میں کہا تھا کہ "حالات اور واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان کا کوئی وجود نہیں۔ درحقیقت سندھیوں کو لوٹنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا گیا تھا

(امروز ۴ راگست ۱۹۷۲ء)

وہاں کی نوجوان نسل میں یہ زہر آلودہ نظریات پھیلائے جا رہے تھے اور ان کے ازالہ یا تدارک کے لئے کچھ نہیں کیا جاتا تھا۔ ذمہ دار ارباب مملکت انہیں کچھ اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ

یہ پھیلتے گئے اور بے محابا پھیلتے گئے۔

بلوچستان

سندھ سے آگے بڑھ کر بلوچستان کی طرف آیئے۔ وہاں بھی صوبائی تعصبات کے خیالات عام کئے جاتے تھے۔ (مثلاً) وہاں کے اس زمانے کے وزیراعلیٰ، سردار عطاء اللہ مینگل نے ۱۹۷۲ء میں کہا تھا:

جس دو قومی نظریہ کی اساس پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا، وہ خلیج بنگال میں غرق ہو چکا ہے۔
(نوائے وقت ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

وہاں کے گورنر میر غوث بخش بزنجو نے ملتان کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا:

پاکستان میں بسنے والی قومیتوں کی تاریخ، جغرافیائی حدود، تہذیب و ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا معاشرہ جدا ہے۔ ہمارا مطالبہ اتنا ہے کہ ان کے نازک احساسات کا خیال رکھا جائے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ پھر پاکستان کو متحد رکھنے کی کیا اساس ہے؟ انہوں نے کہا کہ چار قومیتوں کے مجموعہ سے ایک پاکستانی قوم بنے گی۔ جب ہم آپس میں بات کریں گے تو علیحدہ علیحدہ قومیتوں میں ہوں گے۔ جب کسی غیر ملک سے بات ہوگی تو پاکستانی قوم کی بات ہوگی۔ (نوائے وقت ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

انہوں نے ۱۹۷۸ء میں اور کھل کر باتیں کی تھیں اور مختلف مواقع پر متعدد بیانات دیئے تھے جن کا ملخص حسب ذیل ہے:

۱۔ میر صاحب نے فرمایا کہ "اب میں اس الزام کی طرف آتا ہوں کہ میں نظریۂ پاکستان اور مسلم قومیت کے تصور کے خلاف ہوں۔ نظریۂ پاکستان اور مسلم قومیت کے ان خود ساختہ علمبرداروں کو میرا جواب یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر مسلم قومیت جیسی کسی شے کا وجود نہیں ہے۔ اسی طرح نظریۂ پاکستان نام کی کوئی چیز نہ تو پہلے تھی اور نہ اب ہے۔ ظاہر ہے کہ مجھ پر کسی ایسی چیز کا الزام نہیں لگایا جا سکتا جس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔
(روزنامہ امن کراچی، مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۷۸ء)

۲۔ پاکستان میں چار قومیتیں بستی ہیں، یعنی بلوچی، سندھی، پنجابی اور افغان۔ یہ چار قومیتیں اپنے اپنے مخصوص علاقوں میں بستی ہیں۔ ایک مسلم قومیت کی بجائے ان چار قومیتوں کے الگ الگ وجود کو تسلیم کیا جائے اور ایسا آئین مرتب کیا جائے جس کی رُو سے ان صوبوں کو کامل حق خود اختیاری حاصل ہو۔ اور مرکز کے پاس امورِ خارجہ، دفاع،

مواصلات اور کرنسی کے محکمے رہیں۔ (نوائے وقت مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۷۸ء)

سوچئے کہ اس قسم کی فضا میں پروان چڑھنے والی نئی نسل کی ذہنیت کیا ہوگی اور اس کے عزائم کیا؟

۱۹۶۸ء میں کراچی میں "عوامی ادبی انجمن" کے نام سے ایک سوسائٹی قائم ہوئی تھی جس نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس پر منجملہ دیگر ارباب قلم، جوش ملیح آبادی (مرحوم) اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا:-

ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے۔ وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں، ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

صوبہ سرحد:

مغرب کی طرف آیئے تو صوبہ سرحد کے مردِ بزرگ، خان عبدالغفار خان نے، تقسیم ہند کی مخالفت اس زمانے میں کی تھی جب ہندو بھی اس پہ متفق ہو گئے تھے۔ مرحوم (مولانا) ابوالکلام آزاد نے، اپنی کتاب (انڈیا ونز فریڈم) میں اس امر کا وضاحت سے تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ خان عبدالغفار خان نے کانگریس ورکنگ کمیٹی سے اپیل کی تھی کہ وہ تقسیم ہند کی سکیم منظور نہ کرے انہوں نے نہایت جذباتی انداز میں بار بار کہا تھا کہ "کانگریس نے اگر اب خدائی خدمتگاروں کا ساتھ چھوڑ کر انہیں بھیڑیوں کے حوالے کر دیا تو سرحد کے لوگ اسے کانگریس کی طرف سے غداری قرار دیں گے"۔ (صـ۱۹۳)

چنانچہ وہ اس وقت سے لے کر آج تک پاکستان کے مخالف چلے آ رہے ہیں، اور وقتاً فوقتاً ان بنیادوں کی تردید میں بیان دیتے رہتے ہیں جن پہ پاکستان کی عمارت استوار ہوئی تھی (مثلاً) وہ جب ۱۹۶۹ء میں، کابل سے بھارت گئے تھے تو انہوں نے وہاں کہا تھا۔

میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب قومیت کا معیار کیسے ہو سکتا ہے۔ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے۔ جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی۔ لہٰذا میں اسے کس طرح تسلیم کر لوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ ہم مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ (سٹیٹسمین مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء بحوالہ پاکستان ٹائمز ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء)۔

انہوں نے ۱۹۷۲ء میں ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے، مسٹر دلیپ کمار مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہوگی۔

یہ خان عبدالغفار خان کے خیالات ہیں (میں سردست ان کی تحریک پختونستان اور اس کے عواقب سے قطع نظر کرتا ہوں) ان کے صاحبزادہ خان عبدالولی خان کے بھی یہی خیالات ہیں جن کا وہ اکثر پرچار کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے کلکتہ کے اخبار ہندوستان سٹینڈرڈ کے نمائندہ، سین گپتا کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

بنگلہ دیش کے وجود میں آجانے سے دو قومی نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے

(نوائے وقت ۱۰ ستمبر ۱۹۷۲ء)

انہوں نے اس کے ایک ہی ماہ بعد، برمنگھم میں پاکستانیوں کے ایک منتخب اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ پاکستان غلط تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت اسی نظریہ کو غلط طور پر اساس بنایا گیا تھا۔ لیکن کسی بھی قوم کو زیادہ دیر تک محض جذباتی نعروں سے بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اب بھی اس بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ سراسر غلط ہے ..... مونٹ بیٹن نے جب اپنے اختیارات پاکستان کے گورنر جنرل کو تفویض کئے تھے تو ہم نے اس وقت بھی اس کی مخالفت کی تھی۔ اس وقت ہمیں غدار کہا گیا تھا لیکن آج دنیا نے دیکھ لیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا اور اسلام ہی کے نام پر ٹوٹا ہے۔ (نوائے وقت ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

سقوطِ ڈھاکہ:

انہوں نے جو کہا تھا کہ بنگلہ دیش کی علیحدگی سے دو قومی نظریہ غلط ثابت ہو گیا ہے تو یہ ان کے اپنے خیالات نہیں تھے، یہ اس اعلان کی صدائے بازگشت تھی جو سقوطِ ڈھاکہ کے المیہ پر جشنِ مسرت مناتے ہوئے وہاں کے اس زمانہ کے قائمقام صدر، مسٹر نذر الاسلام نے کہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا:

ہماری یہ فتح نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی، یہ فتح ہے حق کی باطل پر، یہ فتح ہے، ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے سر پھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک

نہیں اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے سیکولر نہیں، وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل، اس پر اصرار نہ کرو لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے، لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بناء پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں ورنہ جو حشر مشرقی پاکستان کا ہوا ہے، وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا، حقائق کسی کے جھٹلائے جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

بلکہ اس اعلان، کی پسِ آئینہ طوطی" ایک اور بھی۔ اور وہ تھی مسز اندرا گاندھی جس نے، اپنی پارلیمان میں، فتح بنگالہ کا جشن مناتے ہوئے کہا تھا:۔

یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے، حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب ۲۵ سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے، وہ حق تھا اور اُن کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

یہ تھے وہ خیالات جنہیں تشکیلِ پاکستان کے بعد سے ملک کے دونوں بازوؤں میں عام کیا جا رہا۔ اور ہمارے اربابِ حل و عقد انہیں ایسی خاموشی سے سنتے رہے گویا یہ کسی "شمبکٹو" کی بات ہے جس کا نہ ان سے کوئی تعلق ہے، نہ ان کے ملک سے کوئی واسطہ۔ طلوعِ اسلام ان سے ہر چند کہتا رہا کہ :۔

ؔ اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی — یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

لیکن وہ نہایت بے اعتنائی سے کہتے رہے کہ تم لوگوں کو غلطی لگ رہی ہے، نہ ہماری آنکھ اشکبار ہے، نہ ہمارا گھر بہہ رہا ہے۔ یہ گھر کسی اور کا ہے ہمارا نہیں۔ ہمیں بار بار جگاؤ نہیں۔ آرام سے سونے دو۔

صوبوں کی حقیقت :-

ان لیڈروں کی تقاریر اور بیانات میں بار بار صوبائی خود مختاری کا ذکر آتا ہے۔ ذکر ہی نہیں بلکہ اسے بطور مطالبہ پیش کیا جاتا ہے۔ چلتے چلتے یہ دیکھتے جائیے کہ ان صوبوں کی حقیقت کیا ہے۔ طلوعِ اسلام نے اپنی اکتوبر ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

تقسیم ہند کے وقت یہ خطۂ زمین، جسے اب مغربی پاکستان کہہ کر پکارا جاتا ہے، چار صوبوں میں منقسم تھا۔ (بلوچستان کو صوبائی حیثیت تو حاصل نہیں تھی لیکن زیرِ نظر موضوع کے لحاظ سے ہم اسے بھی صوبہ ہی کہہ کر پکارتے ہیں)۔ انگریزوں نے یہ تقسیم انتظامی مصالح کی خاطر کی تھی۔ اگر ان کی یہ مصلحت کارفرما نہ ہوتی تو یہ علاقہ بھی، بنگال کی طرح ایک ہی صوبہ ہوتا۔ انگریزی عملداری کے شروع میں پنجاب اور سرحد ایک ہی صوبہ تھے۔ ۱۹۰۱ء میں انہیں الگ الگ صوبے بنا دیا گیا۔ سندھ کو انگریزوں نے ۱۸۴۳ء میں بمبئی کے ساتھ ملا دیا۔ اس وقت پنجاب ابھی انگریزوں کی عملداری میں نہیں آیا تھا۔ اگر اس وقت پنجاب انگریزوں کے پاس ہوتا تو سندھ کو پنجاب کے ساتھ ملایا جاتا نہ کہ بمبئی کے ساتھ۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ صوبوں کی ان لکیروں کو نہ کوئی تقدس حاصل ہے اور نہ ہی کسی قسم کی ازلی سند۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے یہ لکیریں انتظامی مصلحتوں کی خاطر کھینچی گئیں۔ لیکن جس انداز سے یہ لکیریں کھینچی گئیں وہ اس امر کی بھی غماز ہیں کہ ان لکیروں سے مقصد ان کے درمیان نسلی تفرقہ کو برقرار رکھنا اور مستحکم کرنا تھا۔ بلوچستان، سندھ اور سرحد میں سے ہر ایک میں کم و بیش ایک ہی نسل کے باشندے بستے ہیں۔ صرف پنجاب ایک ایسا صوبہ ہے جس میں یہ کیفیت نہیں۔ یہاں مخلوط نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ انگریزوں کی عملداری میں یہ نسلی امتیازات مستقل حیثیت اختیار کر گئے۔ ان کی حکومت کا مفاد اسی میں تھا۔

تاریخِ پاکستان میں ایک بار ایسا بھی ہوا کہ اربابِ اقتدار کو صوبائی تفریق کے خطرات کا احساس ہوا اور انہوں نے اس کے تدارک کی تدبیر بھی سوچی۔ نومبر ۱۹۵۴ء کی شام، اس زمانے کے وزیرِ اعظم نے ریڈیو کراچی سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے کہا:

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے یکم نومبر کے براڈ کاسٹ میں صوبائی تعصب کے خطرات کی طرف توجہ دلائی تھی ..... مجھے یقین ہے کہ آپ سب صوبائیت کے خطرہ سے آگاہ ہوں گے ..... پاکستان میں باہمی تفریق کی ایسی مصنوعی لکیریں کھینچی ہوئی ہیں کہ جن سے ہماری قومی وحدت قائم نہیں رہتی ہمیں بلا استثناء سب کو یقین ہو چکا ہے۔

کہ جب تک ان مصنوعی حدود بندیوں کو نہ توڑا جائے گا، صوبائی تعصب کی لعنت دُور نہیں ہو گی۔ اب یہ مطالبہ چاروں طرف سے اٹھ رہا ہے کہ صوبائیت کی یہ لعنت جو ملت واحدہ کی حیثیت سے ہمارے وجود ہی کو خطرہ میں ڈال رہی ہے، اس کا استیصال ضروری ہے ..... پاکستان کی آئیڈیالوجی ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک قرآن کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اور یہی وہ آئیڈیالوجی ہے جو تمام اہلِ پاکستان کو ایک ملت بنا سکتی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ

کچھ عرصہ پہلے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے نزدیک بہترین اندازِ حکومت تو وحدانی انداز تھا۔ لیکن چونکہ تمام پاکستان کو ایک وحدت بنانا ممکن نہیں، اس لئے ہمیں کم از کم مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دینا چاہیئے۔ مغربی پاکستان کی موجودہ صوبائی تفریق کے لئے کوئی وجہِ جواز نہیں۔ گذشتہ سات سال میں اس مصنوعی تقسیم نے تشتت و انتشار کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کیا ..... ویسے بھی ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم ایسے انداز کی حکومت کی مسرفانہ عیاشی کو برداشت کر سکیں جس میں چھ یا سات الگ الگ اسمبلیاں، الگ الگ وزارتیں، الگ الگ سیکرٹریٹ اور خدا جانے کیا کیا الگ الگ ساز و سامان ہوں۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دیا جائے۔

ہر چند یہ فیصلہ ہمارے لئے موجبِ اطمینان تھا۔ لیکن ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی دسمبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں لکھا کہ

یہ قدم جو اب اٹھایا گیا ہے، ہر چند بڑا اہم اور قابلِ قدر ہے، لیکن یہ بہر حال ایک تخریبی قدم ہے۔ یعنی اس سے صوبائی تفریق کی لعنت ختم ہو گی۔ لیکن ملت کی وحدت اسی صورت میں قائم ہو گی جب اس کے بعد تعمیری قدم بھی اٹھایا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب جو صوبائی تفریق کا سانپ مرا ہے تو اس کی لکیریں بھی باقی نہیں رہنی چاہئیں۔ مفاد پرست گروہ یقیناً اس قسم کے سوالات پیدا کرے گا کہ اس نئی وحدت میں پرانے صوبائی تحفظات ضرور ہونے چاہئیں۔ اگر اس قسم کا کوئی مطالبہ بھی تسلیم کر لیا گیا تو یاد رکھئے، جس مقصد کے لئے یہ قدم اٹھایا گیا ہے وہ کبھی حاصل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے بعد ہمیں ہر قدم ایسا اٹھانا چاہیئے جس سے اس فتنۂ ماضی کی یاد تک بھی دلوں میں باقی نہ رہے۔ پٹھانی، پنجابی، سندھی، بلوچی، الگ الگ کلچر اور روایات کا خیال عہدِ جاہلیت کے تصورات کا نتیجہ ہیں۔ مسلمان کا ایک ہی کلچر ہوتا ہے اور ایک ہی روایات۔ اسلام۔ اس کا کلچر ہے اور اسلامی روایات ہی اس کی

روایات ہیں۔ لہٰذا اس خیال کے مطابق جداگانہ تحفظات کے کسی مطالبہ کو تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ البتہ جو علاقے پسماندہ ہوں ان کی مدد کر کے انہیں دوسروں کے برابر لے آنا سب سے پہلا فریضہ ہے۔ اسی کا نام قرآن کی زبان میں "احسان" ہے۔ یعنی جہاں کسی کی کسی کمی سے معاشرہ کے توازن میں فرق آجائے اس کمی کو پورا کر کے معاشرہ کے حسن کو برقرار کر دیا جائے۔ اس باب میں طلوعِ اسلام وقتاً فوقتاً اپنے مشورے پیش کرتا رہے گا۔

وحدتِ مغربی پاکستان (جسے ONE-UNIT کی اصطلاح سے پکارا جاتا تھا) وجود میں تو آگئی لیکن اس سے جو انتظامی اسقام پیدا ہوئے۔ ان کی اصلاح کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ چاہیئے یہ تھا کہ پسماندہ علاقوں کی بہبود کے لئے خصوصی اقدامات کئے جاتے اور مختلف علاقوں کے مقامی حکام کو زیادہ سے زیادہ وسیع اختیارات دے دیئے جاتے تاکہ عوام کو اپنے روزمرہ کے معاملات کے تصفیہ اور مسائل کے حل کے لئے دور دراز سفر طے کر کے مرکزی دارالحکومت میں نہ آنا پڑتا۔ لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ اس سے عوام کو جو مشکلات پیش آئیں ان سے ان کے دل میں ون یونٹ کے خلاف جذبات ابھرنے شروع ہو گئے۔ جوں جوں ان مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا ان کی مخالفت کے جذبات شدید سے شدید تر ہوتے گئے۔ صوبوں کے الگ الگ وجود کے ساتھ، سیاسی راہنماؤں اور ان کی پارٹیوں کے مفاد وابستہ تھے۔ ون یونٹ سے یہ مفادات ختم ہو گئے تو انہوں نے عوام میں اشتعال پیدا کرنا شروع کر دیا۔ ہمیں انتہائی صدمہ سے لکھنا پڑتا ہے کہ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ حتیٰ کہ جب ۱۹۶۸ء میں چار کمیشنوں کا فتنہ جگایا گیا تو اسے فرو کرنے کے لئے کوئی بھی مؤثر قدم نہ اٹھایا گیا اور جنرل یحییٰ کے دور میں ون یونٹ کو ختم کر کے پھر سے صوبجاتی نظام قائم کر دیا گیا۔

ون یونٹ :

یہ ہے صوبجاتی تفریق کے ماضی کی داستان۔ اس کے خطرات سامنے آتے رہے لیکن ان کے تدارک کے لئے کوئی مؤثر اقدام نہ کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ ؎

دل میں گریہ نے پھر اک شور اٹھایا غالبؔ آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا وہ طوفاں نکلا

میں نے ان الم انگیز واقعات کو محض تاریخی کوائف کے طور پر دھرایا ہے۔ اس سے کسی کو موردِ الزام قرار دینا مقصود نہیں۔ یہ تاریخ کا فریضہ ہے جسے وہ خود ادا کریگی۔ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے کہ اس تشتت و انتشار کے اسباب کیا ہیں۔ میں اپنے لئے کوئی سرٹیفکیٹ پیش نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے تحریکِ پاکستان کے دوران

کچھ امکانی خدمات سرانجام دیں تو اس لئے کہ ایک قرآنی مملکت کا قیام میرا عجز و ایمان تھا۔ اس کے بعد میں، اس خطۂ زمین کے تحفظ اور استحکام کے لئے ہر ممکن کوشش کئے چلا آ رہا (اور کئے چلا جا رہا) ہوں کہ اگر یہ خطۂ زمین باقی رہا تو اس میں کسی وقت، قرآنی مملکت کے قیام کے امکانات ہیں (خدانخواستہ) یہ زمین ہی نہ رہی تو اس پر "مسجد" کسطرح بن سکے گی؟ میرے یہی جذبات ہیں جو ارباب فکر و نظر کو اس دعوت دینے کے محرک ہیں کہ وہ نہایت سنجیدگی سے سوچیں کہ اس انتشار کے اسباب کیا ہیں۔ جو کچھ میں سمجھا ہوں، اسے پیش کرتا ہوں۔

غور طلب:

ان لیڈروں نے بار بار کہا ہے کہ مذہب، قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ وہ ایسا کہنے میں حق بجانب ہیں مذہب واقعی قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

میرے منہ سے یہ الفاظ سن کر آپ کو بیحد حیرت ہوئی ہوگی۔ جو شخص، ۱۹۳۰ء سے یہ کہتا چلا آ رہا ہے کہ دو قومی نظریہ اسلام کا بنیادی اصول ہے ——— اور دو قومی نظریہ کے معنی یہ ہیں کہ اسلام میں قومیت کا معیار، رنگ، زبان، نسل، وطن کا اشتراک نہیں، ایمان کا اشتراک ہے، وہ آج کسطرح کہہ سکتا ہے کہ مذہب، قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ میں بھی ٹھیک کہتا ہوں اور آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ اور اسی نکتہ کے سمجھ لینے سے سارا مسئلہ سمجھ میں آجائے گا۔

مذہب قومیت کا معیار نہیں:

علامہ اقبالؒ نے جب (اپنے ۱۹۳۰ء میں) کہا تھا کہ جداگانہ مملکت کے قیام سے مقصود یہ ہے کہ اسلام پر جو زنگ ملوکیت کے زمانے میں چڑھ گیا تھا، اسے اتار کر صدر اوّل کے قرآنی اسلام کو تازہ کر دیا جائے، تو اس کے معنی یہ تھے کہ اسلام جو "مذہب" کی شکل اختیار کر چکا تھا اس کی جگہ الدین کو نافذ کیا جائے۔ وہ جو بار بار کہتے تھے (اور قائداعظمؒ بھی اسے دہراتے رہے کہ) پاکستان میں مذہبی پیشوائیت نہیں ہوگی۔ تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ تو اس کا عملی مفہوم یہی تھا کہ وہاں دین کا نفاذ ہوگا، مذہب کا نہیں۔ اسلام میں مذہب تو ہوتا ہی نہیں، دین ہوتا ہے۔ اور یہی دین قومیت کا معیار ہوتا ہے۔ مذہب (خواہ وہ کوئی مذہب ہو) نہ کبھی قومیت کی بنیاد بنا ہے، نہ بن سکتا ہے۔ آج دنیا میں سب سے بڑا مذہب، عیسائیت ہے آپ سوچئے کہ کیا دنیا کے عیسائی ایک قوم کے افراد ہیں؟ قطعاً نہیں۔ یہودی اگر ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہے ہیں تو مذہب کی بنیاد پر نہیں، نسلی بنیاد

پر ایسے رہے ہیں (اور اب وطنی مملکت کی بنا پر ایک قوم ہیں)۔ ہندو، ہندو دھرم کی بنیاد پر ایک قوم نہیں، وطن کی بنا پر ایک قوم ہیں۔ جو ہندو ہندوستان سے باہر چلے گئے ہیں وہ ہندو مذہب کے اشتراک سے، ہندوستان کے ہندوؤں کی ہم قوم نہیں۔ اور آخر میں مسلمانوں کو لیجئے۔ یہ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ کیا یہ ایک قوم کے افراد ہیں، حالانکہ ان سب کا مذہب اسلام ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسلام نے صدر اوّل میں جو امتِ واحدہ متشکل کی تھی تو اس کے لئے اس نے مذہب کو مٹا کر دین کو بنیاد بنایا تھا۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا حصولِ پاکستان سے مقصد یہی تھا کہ یہاں دین کا احیاء کیا جائے جس سے یہاں کے مسلمان اشتراکِ وطن کی بنا پر نہیں، اشتراکِ دین کی بنا پر ایک قوم (امتِ واحدہ) بن جائیں۔ ہم نے پاکستان میں دین کو نافذ نہیں کیا۔ رہی مذہب جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا اور جو (زمانہ کے تقاضوں سے) نیم جان ہو رہا تھا، اسے از سرِ نو زندہ کیا جا رہا ہے۔ اس مذہب سے ہم توقع کر رہے ہیں کہ یہ ہمیں ایک قوم بنا دے گا۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، دنیا کے مسلمانوں کی قریب ایک ارب آبادی کا مذہب ایک ہی ہے لیکن وہ مختلف قوموں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور اس تفریق کا یہ عالم ہے کہ (مثلاً) ایران اور عراق میں برسوں سے جنگ جاری ہے۔ اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے کوشش کر کے دیکھ لیا ہے کہ ان میں صلح ہو جائے، لیکن وہ اس میں ناکام رہے ہیں۔

مسلمان ایک قوم نہیں:

افغانستان میں ہم مذہب مسلمان ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ یاسر عرفات سے منسوب فلسطینیوں کے دو گروہوں میں قتل و خوں ریزی کا بازار گرم ہے۔ کیا آپ اس مذہب سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ایک قوم بنا دے گا؟ خود پاکستان کو دیکھئے۔ انارکلی میں شام کے وقت مسلمانوں کے ہجوم میں تفرقہ کی علامت تک نہیں ہوتی لیکن جونہی اذان کی آواز بلند ہوتی ہے، ان میں کوئی اس مسجد کا رخ کر لیتا ہے، کوئی اس کا۔ مذہب ان میں اس طرح تفرقہ پیدا کر دیتا ہے اس سے محفوظ وہ رہتے ہیں جو نماز پڑھنے نہیں جاتے۔ ولیے کے ولیے بازار میں گھومتے رہتے ہیں۔ متحدہ محاذ کی تحریک کے دوران کوثر نیازی صاحب نے کہا تھا کہ اگر مفتی محمود اور مولانا نورانی ایک ساتھ نماز پڑھ لیں تو حکومت اپنے امیدوار کو بٹھا لے گی۔ ان دونوں نے چودھری ظہور الٰہی (مرحوم) کی کوٹھی میں افطاری کے بعد الگ الگ نماز پڑھ کر اعلانیہ بتا دیا کہ مذہب کی بنیاد پر اکٹھا ہونا ناممکن ہے۔ یہاں زکوٰۃ کا قانون پبلک لاء کی حیثیت سے نافذ ہوا۔ پبلک لاء سے مراد ہوتی ہے وہ قانون جس کا اطلاق ساری قوم پر یکساں ہو۔ لیکن چند

ہی دنوں کے بعد، یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر نہیں ہو سکتا۔ ہر فرقہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق، اپنے طور پر زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس، انکم ٹیکس کا قانون، جو انگریز کے زمانے سے سیکولر چلا آتا ہے، شیعہ، سنی، اہل حدیث، حنفی، دیوبندی۔ بریلوی سب پر یکساں لاگو ہے۔ یعنی وہ لوگ جو سیکولر قانون کی رُو سے ایک قوم تھے (اور ہیں) مذہبی قانون کی رُو سے ہی مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ سوچئے کہ اگر وہ لیڈر جن کا ذکر سابقہ صفحات میں آیا ہے کہتے ہیں کہ مذہب، قومیت کا معیار نہیں ہو سکتا تو کیا وہ غلط کہتے ہیں؟ مذہب فی الحقیقت قومیت کا معیار نہیں بن سکتا، دین بن سکتا ہے جس میں قوانین اور احکام کا سرچشمہ صرف ایک ہوتا ہے۔ یعنی خدا کی کتاب قرآن مجید۔ جو شخص اسے ضابطۂ قوانین مانتا ہے، وہ مسلم قومیت کا فرد بن جاتا ہے۔ جو اسے تسلیم نہیں کرتا، وہ دوسری قوم کا فرد ہوتا ہے۔

یہ تھے وہ حقائق جن کی روشنی میں طلوعِ اسلام نے بہت پہلے کہا تھا کہ یا تو مملکت پاکستان کو دین اختیار اور نافذ کرنا چاہیئے، اور اگر ایسا کرنے کی ہمت اور جرأت نہ ہو تو پھر جرأت کر کے اس کا اقرار کر لینا چاہیئے اور سیکولرازم کو اپنا نظام قرار دے لینا چاہیئے۔ سیکولرازم میں مذہب اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے اور امورِ مملکت عام دنیاوی طریق پر طے پاتے چلے جاتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ہاں یہی حالت ہے۔ ہر فرقہ اپنے اپنے طریق کے مطابق مذہب پر کاربند ہے اور دنیاوی امور، بالعموم (انگریز کے زمانے کے) سیکولر قوانین کے مطابق طے پاتے ہیں۔ یہ جو (ISLAMISATION) کا عمل جاری ہوا ہے، تو یہ ان قوانین کو مذہبی بنانے کی کوشش ہے۔ دینی بنانے کی نہیں۔ زکوٰۃ سے متعلق قانون اس پر شاہد ہے کہ ان کے مذہبی بن جانے سے فرقہ وارانہ انتشار اور بھی بڑھ جائے گا۔

ہمیں اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہم اگر ایک قوم ہیں تو وطنی ریاست کی رُو سے ہیں، مذہب کی رُو سے نہیں۔ اس کے بعد ان معترضین سے گفتگو، ملکی سیاست کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔

ہمارے ہاں ایک پیچیدگی اور بھی ہے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) صوبوں کی تقسیم تو انتظامی مصلحتوں کی رُو سے عمل میں آئی تھی، لیکن تین صوبوں (بلوچستان، سندھ اور سرحد میں سے ہر ایک) میں آبادی (کم و بیش) ایک نسل پر مشتمل ہے۔ چنانچہ یہ معترضین جب صوبہ جاتی خود مختاری کی بات کرتے ہیں تو اس کی وجہ بات میں نسلی، لسانی اور ثقافتی امتیاز کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ اگر ان امتیازات کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کی حیثیت مستقل ہے، تو پھر اہل پاکستان وطنی ریاست کی بنا پر بھی محض سیاسی طور پر ایک قوم بن سکیں گے، درحقیقت ایک قوم نہیں بن سکیں گے۔ اس وقت ان کی زندگی عرب جاہلیہ کے (دور قبل از اسلام) کے قبائل کی سی ہو گی۔ جن میں نسلی رقابت، پیہم تصادمات، بلکہ خانہ جنگیوں اور خوں ریزیوں کا موجب بنی رہتی تھی۔

یہ اس ملک کا بنیادی مسئلہ ہے جس کا حل سب سے مقدم ہے۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ قوم، جماعتی اور غیر جماعتی انتخابات۔ پارلیمانی یا صدارتی نظام جیسے فروعی مسائل میں الجھ رہی ہے اور اس بنیادی مسئلہ کی طرف کسی کی نگاہ نہیں اٹھتی۔ دستور کی رُو سے، مرکز اور صوبوں میں حقوق اور اختیارات کی تقسیم بھی اس کا یقینی حل نہیں کیونکہ اس کی جڑیں بہت دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ جڑیں کس حد تک دُور جا چکی ہیں، اس کا اندازہ، لاہور سے شائع ہونے والے روزنامہ جنگ کی ۸ دسمبر ۱۹۸۳ء میں شائع شدہ ایک تفصیلی خبر سے لگائیے۔ اس میں، مسٹر حفیظ کاردار کی ایک زیرِ طبع کتاب میں میر غوث بخش بزنجو اور سردار اکبر بگٹی کے انٹرویوز کا ذکر ہے۔ میر بزنجو کیساتھ انٹرویو کے سلسلہ میں لکھا ہے:

مسٹر بزنجو نے ملک کے اندر اتحاد کی فضا کو قائم کرنے کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اگر پنجاب کے لوگ اپنے اور دوسروں کے مفادات کا خیال نہیں کرتے تو کوئی دوسرا اس ملک کو اکٹھا نہیں رکھ سکتا۔ پنجابی اگر سمجھتا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ اور فوج اس کے ترجمان ہیں تو یہ ان کا وہم ہے۔ ان لوگوں کو پنجابیوں کے حقوق کا کوئی خیال نہیں انہیں تو اپنے مفادات پورے کرنے سے فرصت نہیں اگر ملک کو ایک رکھنا ہے تو تمام صوبوں کو بھی مساوی اہمیت دینا ہوگی تمام صوبوں کو ایک وفاق کے اندر رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہونی چاہیئے۔ پنجاب نے بنگالیوں کیساتھ یہ سلوک نہیں کیا وہ الگ ہوگئے اگر اب بھی ایک وحدت کے اندر رہتے ہوئے تمام صوبوں کو مساوی حقوق نہ دیئے گئے تو میں کسی اور کی بات نہیں کرتا لیکن یہ بتا دوں کہ بلوچستان الگ ہو جائے گا۔ اس کے سوا کوئی راستہ سامنے نہیں۔ مسٹر حفیظ کاردار نے اپنی کتاب میں مسٹر بزنجو کے انٹرویو کو رقم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انٹرویو کے آخر میں مسٹر بزنجو نے مجھے (کاردار کو) مخاطب کر کے کہا "پنجابی ہونے کی بنا پر تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بلوچستان میں تمہارے خلاف شدید نفرت ہے۔ پنجاب کی قیادت کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہے لیکن تم پنجابی اچھے منیجر تو ہو لیکن اچھے حاکم ثابت نہیں ہوئے حکومت کے لئے تم نے ہمیشہ غیروں کی طرف دیکھا ہے کس قدر قابلِ رحم ہو تم کہ تمہیں اپنی زبان اپنے کلچر سے بھی شرم محسوس ہوتی ہے ان حالات میں تم پاکستان کی قیادت کیا کر سکتے ہو؟ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تم پنجابی ملک میں اکثریت میں ہو، پنجاب کی آبادی ساٹھ فیصد ہے، خدا نے پنجاب کو زرخیز زمین عطا کی ہے علم تمہارے پاس ہے صلاحیتیں تمہیں ودیعت کی گئی ہیں فنی طور پر تم زیادہ تربیت یافتہ ہو لیکن ان تمام کے باوجود تم ملک میں مرکزی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں۔

اس کے بعد نواب بگٹی کے ساتھ انٹرویو کا ملخص ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

جناب اکبر بگٹی سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے، مسٹر کاردار نے لکھا ہے کہ نواب اکبر بگٹی نے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ۱۹۴۷ء کے ریفرنڈم میں پاکستان کے لئے ووٹ دیا۔ انہوں نے کہا کہ پنجاب کی تین قوتوں فوجی قیادت، افسر شاہی اور صنعتکاروں کے چنگل سے نکلنا آج ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ جناب کاردار نے لکھا ہے کہ ان قوتوں میں بگٹی صاحب نے جاگیرداروں کو شامل نہیں کیا کیونکہ وہ خود بھی ایک جاگیردار ہیں۔ کتاب میں لکھا ہے کہ جب بگٹی صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کو مستقبل میں بہتری کی کوئی امید نظر آتی ہے تو انہوں نے پوچھا کس کے مستقبل کی؟ تمہارے یا میرے؟ پنجاب کے یا بلوچستان کے۔ انہوں نے کہا مینگل اور مری باہر جا کر آزاد بلوچستان کے لئے کام کر رہے ہیں اور گیند پنجابیوں کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ایک نہیں چار قوموں کے پاکستان کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ موجودہ دور میں بلوچستان میں ہونے والی ترقی کے متعلق جناب بگٹی نے کہا کہ یہ سب کاغذی کارروائی ہے اور سارا پیسہ حکومتی مشینری ہضم کر گئی ہے۔ مسٹر بگٹی نے قوم کے مستقبل کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اب پاکستان میں ایک نہیں چار قومیں ہیں ہم سب کو مساوی بنیاد پر ساتھ چلنا ہوگا اگر آپ یہ احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر آپ کامیاب ہو سکتے ہیں ورنہ مذہب زیادہ دیر تک رشتۂ اتحاد کے طور پر کام نہیں دے سکتا جیسا کہ مشرقی پاکستان کے سلسلے میں ہوا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی کتابیں شائع کرنے کا کچھ فائدہ نہیں الٹا نقصان کا احتمال ہے۔ اگر کسی کے دل میں مملکت پاکستان کی بہبود کا جذبہ ہے تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ نہایت دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ انداز سے جائزہ لیا جائے کہ ملک میں جو لوگ فعال یا مؤثر حیثیت کے حامل ہیں:

۱۔ ان میں کتنے ایسے ہیں جو شروع سے تقسیم ہند کی سکیم کے خلاف تھے اور اب تک خلاف ہیں۔

۲۔ جو مملکت پاکستان کے جداگانہ وجود کے تو قائل ہیں، لیکن مختلف صوبوں میں بسنے والے لوگوں کو الگ الگ قوم قرار دیتے ہیں۔

۳۔ جو ان چار قوموں کے وجود کے قائل ہیں وہ انہیں کیا حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک مملکت کے اندر تو ایک قوم ہی ہو سکتی ہے۔ مختلف قومیں نہیں ہو سکتیں۔

۴۔ جو صوبائی قومیت کے قائل نہیں لیکن انہیں شکایت ہے کہ صوبوں کے ساتھ منصفانہ اور مساویانہ سلوک نہیں ہوتا۔

اگر اس قسم کا جائزہ محنت اور دیانت سے لیا جا سکے تو اس کے نتیجہ میں جو معلومات فراہم ہوں گی انکی روشنی میں ہم اس تاریکی سے نکل سکیں گے جس میں ہم اس وقت ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں اور کسی کو معلوم ہی نہیں کہ ہم کس مقام پہ کھڑے ہیں! ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی خوش فہمیوں میں مگن رہیں اور آخر الامر ہمیں (اقبال کے الفاظ میں) فریاد کرنی پڑے

قصے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔ خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے!

میں نے (مرحوم صدر) محمد ایوبؔ خاں سے کیا کہا تھا!

(پرویز)

کراچی سے شائع ہونے والے (انگریزی) روزنامہ، ڈان کی ۱۹ نومبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں یحییٰ سیّد (YEHIA SYED) نامی کسی صاحب کا ایک مقالہ (یا مراسلہ) شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے، محترم الطاف گوہر صاحب کی زیرِ تصنیف کتاب — عہدِ ایوب کی تاریخ — کے کچھ اقتباسات پیش کئے ہیں۔ الطاف گوہر صاحب (مرحوم صدر) کے دورِ حکومت میں سیکرٹری اطلاعات تھے۔ ان اقتباسات میں کہا گیا ہے کہ (مرحوم صدر) محمد ایوبؔ خاں کو مختلف اشخاص نے، امورِ سیاست کے متعلق مختلف مشورے دیئے تھے۔ ان میں ایک اقتباس یہ ہے:-

> پرویزی تحریک والے، مسٹر جی۔ اے پرویزؔ نے سنہ ۱۹۶۰ء کو ایوب خان کو مشورہ دیا تھا (جب کہ وہ ۱۹۶۲ء کے آئین کی تیاری میں مصروف تھے) کہ۔
>
> (۱) سیاسی پارٹیاں اور مذہبی فرقے نہ صرف خلافِ اسلام ہیں بلکہ شرک ہیں۔
>
> (۲) پارلیمانی نظام پاکستان کے (اس وقت کے) حالات کے پیشِ نظر موزوں ہے۔ اور
>
> (۳) سنہ ۱۹۵۶ء کا آئین جسے ایوبؔ خان نے کالعدم قرار دیدیا تھا، غیر اسلامی اور ناممکن العمل تھا، اور اس قابل کہ اسے منسوخ کر دیا جائے۔

مقالہ میں کہا گیا ہے کہ:-

> الطاف گوہر (صاحب) نے اپنی کتاب کی بنیاد، ایوبخان کی ڈائری، کاغذات اور دستاویزات پر رکھی ہے جو غیر شائع شدہ ہیں، اور جنہیں ایوبؔ خان نے اپنی زندگی میں الطاف گوہر کی تحویل میں دے دیا تھا

میں نے سوچا تھا کہ مجھے اس مسئلہ کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں کہنا چاہیئے جب تک الطاف گوہر صاحب کی کتاب شائع نہ ہو جائے اور یہ دیکھ نہ لیا جائے کہ انکے الفاظ کیا ہیں۔ ان الفاظ کا سیاق وسباق کیا، اور مصنف کے پاس ان کے دعویٰ کا ثبوت کیا ہے۔ لیکن ان اقتباسات کو مختلف (اردو)

اخبارات[1] نے اپنے ہاں شائع کر دیا جس کی وجہ سے میرے متعدد احباب نے تقاضا کیا کہ مجھے اپنی پوزیشن بلا تاخیر واضح کر دینی چاہیئے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔ اس مشورہ (بلکہ تقاضا) کے پیشِ نظر میں نے مناسب سمجھا ہے کہ اصل واقعات، بلا تنقید و تبصرہ، صفحۂ قرطاس پر لے آئے جائیں۔

اصولی تمہید

اصل موضوع تک آنے سے پہلے میں دو ایک وضاحتیں بطور اصول ضروری سمجھتا ہوں۔ دورانِ ملازمت بہت سے ایسے راز، سرکاری ملازم کے علم اور تحویل میں آتے ہیں، جنہیں ملازمت کے قواعد و ضوابط کی رُو سے افشا نہیں کیا جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد، اس ملازم پر اخلاقاً پابندی عائد ہوتی ہے کہ وہ ان رازوں کو افشا نہ کرے۔ وہ راز اس کے پاس حکومت کی امانت کے طور پر ہوتے ہیں، اور ان کا افشا (میرے نزدیک) امانت میں خیانت کے مرادف ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ کسی شخص کی وفات کے بعد، اس کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں کہنی چاہیئے جس کا تحریری ثبوت موجود نہ ہو، اور وہ تحریری ثبوت بھی راز دارانہ نہ ہو۔ مرنے والا اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ اپنی مدافعت کر سکے۔ اس کی اس مجبوری کو (EXPLOIT) کرنا، میرے نزدیک اس پر ظلم ہے۔

بہ امور بہرحال، میں نے اپنے اصولوں کے طور پر بیان کئے ہیں جن سے اتفاق یا اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔

صدر ایوب کیساتھ میرے تعلقات

اس کے بعد میں (مرحوم صدر) محمد ایوب خان کے ساتھ اپنے تعلقات کے متعلق کچھ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ مرحوم (کمانڈر۔ان۔چیف کے منصب پر سرفراز ہونے سے بھی پہلے) میری قرآنی فکر سے متعارف تھے اور میرے لٹریچر کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ سربراہ مملکت ہو جانے کے بعد بھی ان کی یہ دلچسپی برابر جاری رہی۔ میری تصانیف ان کی ذاتی لائبریری میں موجود رہتی تھیں، اور وہ طلوعِ اسلام کا مطالعہ التزاماً

---

[1] ہمارے ہاں کی صحافتی دیانت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ الطاف گوہر صاحب نے لکھا ہے: "پرویزی تحریک والے، غلام احمد پرویز" اور روزنامہ جنگ (راولپنڈی) نے اسکا ترجمہ یوں شائع کیا ہے۔ "منکرینِ سنت کے سرخیل مسٹر غلام احمد پرویز"..... (جنگ، مورخہ ۱۹ نومبر)۔ یہ حضرات جب تک کسی کو گالی نہ دے لیں ان کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوتا!

کیا کرتے تھے۔ ان کی تاکید تھی کہ طلوعِ اسلام انہیں بلا تاخیر پہنچا دیا جایا کرے۔ ان سے ملاقات کے دوران، طلوعِ اسلام میں پیش کردہ اہم نکات، اکثر زیرِ بحث آتے۔ قرآنی فکر و تعلیم کے ساتھ انہیں خاص لگاؤ تھا۔ اور یہی ان کے ساتھ میرے روابط اور مراسم کی بنیاد تھی۔ یہ انکی کشادہ ظرفی تھی کہ وہ مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔

اس تعارف کے بعد یہ حقیقت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ میں، صدر مرحوم کے ساتھ ملاقات کے دوران (زبانی بھی) وہی کچھ کہتا تھا جو میری کتابوں میں تحریر اور طلوعِ اسلام میں قلمبند ہوتا تھا۔ اگر میں کبھی کوئی بات، ان کے خلاف کہتا تو اس کے بعد انہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ وہ میری قرآنی فکر سے کسقدر متاثر تھے۔ اس کا اندازہ ان کی اُن تقاریر سے بآسانی لگ سکتا ہے جو انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں مختلف اوقات میں، مختلف مقامات پر، اور مختلف تقاریب میں کیں۔ اور جن میں سے اکثر طلوعِ اسلام کے فائلوں میں محفوظ ہیں[۲]۔ ان سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اسلام (بہ حیثیت دین) کے اصولوں کے متعلق ان کے خیالات کسقدر میری فکر کے ہم آہنگ تھے۔

۱۹۵۶ء کا آئین

ان تمہیدات کے بعد اب آیئے ان نکات کی طرف جو الطاف گوہر صاحب کے حوالے سے، میری طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ میں نے صدر مرحوم سے کہا تھا کہ ۱۹۵۶ء کا آئین غیر اسلامی اور ناممکن العمل تھا۔ صدر مرحوم ۱۹۵۸ء کے اواخر میں برسرِ اقتدار آئے تھے۔ اور ۱۹۵۶ء کے آئین کو طلوعِ اسلام نے ۱۹۵۶ء ہی میں مسترد کر دیا تھا۔ اس نے اپنی اشاعت بابت فروری ۱۹۵۶ء میں، اس دستور پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد لکھا تھا کہ:-

اس آئین کو، آئینِ مفاہمت (CONSTITUTION OF COMPROMISES) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مذہب اور سیاست میں مفاہمت، مُلّا اور حکومت میں مفاہمت، اصول اور مصلحت میں مفاہمت، مشرق اور مغرب میں مفاہمت۔ اے کاش، (ان دستور ساز حضرات کو) معلوم ہوتا کہ حق اپنے مقام پر اٹل ہوتا ہے اور اپنے اندر مفاہمت کی ذرا بھی گنجائش نہیں رکھتا

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول ۔ (ص ۵)

اس کے بعد طلوعِ اسلام بابت مارچ (۱۹۵۶ء) کے لمعات میں اس اجمال کی تفصیل دی گئی تھی۔

ص۲ ان میں سے بعض تقاریر آخر میں منقول ہیں۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کو "قابلِ استرداد" (مرحوم صدر) ایوب خان کی کسی مصلحت جوئی کی خاطر نہیں کہا گیا تھا۔ اس آئین کو اُس کے یوم پیدائش کے وقت ہی ایسا قرار دے دیا گیا تھا اور یہ (صدر مرحوم) کے برسرِ اقتدار آنے سے قریب تین سال پہلے کی بات ہے۔

مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں

کہا گیا ہے کہ میں نے صدر مرحوم سے کہا کہ مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں خلافِ اسلام اور شرک ہیں۔

میں قریب پچاس سال سے قرآنی فکر اور تعلیم کے متعلق مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ اس وقت تک میری تین درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں بعض کی ضخامت ڈیڑھ ڈیڑھ، دو، دو ہزار صفحات تک پہنچ رہی ہے۔ ماہنامہ طلوعِ اسلام ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا اور پاکستان میں ۱۹۴۸ء سے مسلسل (اور بلا انقطاع) شائع ہو رہا ہے۔ ان کے علاوہ، میرے ہفتہ واری درسِ قرآن کریم کا سلسلہ قریب تیس سال سے جاری ہے جو کیسٹس میں ریکارڈ اور محفوظ ہیں۔ آپ ان میں سے کسی تحریر اور تقریر پر غور کریں۔ یہ بنیادی حقیقت ہر جگہ نمایاں نظر آئے گی کہ قرآن کی رُو سے، تمام مسلمان امتِ واحدہ کے افراد ہیں، اور امت میں تفرقہ، خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں، قرآن کے خلاف اور شرک ہے۔ شرک کا لفظ، کسی تاویل یا تعبیر سے مستنبط نہیں۔ قرآن کریم نے یہ نص صریح تفرقہ کو شرک کہا ہے۔ جو کچھ میں ہزار بار لکھ اور کہہ چکا ہوں، اسے ایک بار پھر دہرا دینے میں کوئی باک نہیں سمجھتا طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۵۹ء میں کہا گیا تھا کہ "قرآن نے تمام مسلمانوں سے کہا ہے کہ ہم نے تمہیں ایک امت بنایا ہے۔ (وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (یا) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ) یعنی تمام مسلمان امتِ واحدہ ہیں اس لئے ان کا ایک سے زیادہ حصّوں میں بٹ جانا منشائے خداوندی کے خلاف ہے۔ اسی مقصد کے لئے اس نے انہیں تاکیدی حکم دیا ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۳) یعنی تم سب مل کر اللہ کی رسی کو تھامے رکھو اور آپس میں تفریق مت پیدا کرو۔ اس آیت میں "حبل اللہ" واحد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دین ایک غیر منقسم وحدت ہے جس کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں نہ متفرق حصّے۔ "وَاعْتَصِمُوْا" جمع کا صیغہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مسلمان ایک ہی مسلک پر کاربند رہیں گے۔ علاوہ ازیں "جمیعًا" کے اضافے نے اس میں اور بھی تاکید پیدا کر دی ہے۔ یہاں تک مثبت حکم تھا۔ اس کے آگے "وَلَا تَفَرَّقُوْا" کہہ کر بات میں وضاحت اور حکم میں مزید تاکید پیدا کر دی۔ اسی حکم کی تصریح دوسرے مقام پر ان الفاظ سے کر دی "وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ" (۳/۱۰۵) "اے مسلمانو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح احکام آجانے کے بعد باہمی تفرقہ پیدا کر لیا اور ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگ گئے

یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا کا بہت بڑا عذاب ہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے فرقہ بندی اور امت میں باہمی اختلاف خدا کا عذاب ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھئے۔ سورہ روم میں ہے: وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا (۳۰/۳۱-۳۲)۔ "اے مسلمانو! دیکھنا کہیں تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک پارٹی بن بیٹھے۔ جب کسی قوم میں فرقے پیدا ہو جائیں تو ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ اپنے مسلک کو حق و صداقت کا مسلک سمجھ کر اس میں مگن رہتا ہے اور دوسروں کے متعلق سمجھتا ہے کہ وہ سب باطل ہیں"۔

آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم فرقہ بندی کو شرک قرار دے رہا ہے۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایک خدا اور ایک ضابطۂ حیات پر ایمان رکھنے کا لازمی نتیجہ امت کی وحدت ہے۔ اگر امت فرقوں میں بٹ جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کے مقرر کردہ ضابطۂ حیات پر کاربند نہیں رہتی۔ اسی کا نام [illegible] ہے۔ امت میں فرقے پیدا کر لینا ایسا سنگین جرم ہے کہ نبی اکرمؐ سے بالفاظ صریح کہہ دیا گیا کہ، إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۵۹)۔ "یعنی جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں اور خود ایک گروہ بن بیٹھیں اے رسولؐ! تجھے ان سے کوئی واسطہ نہیں"۔ چنانچہ غالی سے غالی فرقہ پرست بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں امت میں فرقے تھے۔

آپ قرآن کریم کی ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا اس بات کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایک مملکت میں مسلمان مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہوں، ہر فرقہ اپنی مستقل ہیئت کو برقرار رکھے، اور اس کے باوجود اس مملکت یا اس کے آئین اور نظام کو اسلامی کہا جائے؟ یہ دو متضاد باتیں ہیں جو ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ مملکت وہی اسلامی کہلا سکتی ہے جس کے اندر تمام مسلمان امتِ واحدہ کی حیثیت سے رہیں۔ ان میں کوئی فرقہ نہ ہو۔ یہی شکل کتاب اللہ کے مطابق ہے اور یہی سنت رسول اللہؐ کے مطابق۔ امت میں فرقوں کا وجود قرآن کے بھی خلاف ہے اور سنت رسول اللہؐ کے بھی خلاف۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے جس تفرقہ کو شرک کہا ہے اس میں مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں سب شامل ہیں۔ اس لئے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔

اس سے واضح ہے کہ میں نے، صدر مرحوم کی کسی سیاسی مصلحت کی خاطر ان کے کان میں یہ افسوں نہیں پھونک دیا تھا کہ سیاسی پارٹیاں خلافِ اسلام ہیں، انہیں کالعدم قرار دے دیجئے۔ یہ قرآن کریم کا وہ فیصلہ تھا جو چودہ سو سال سے ابدی طور پر چلا آ رہا تھا اور جسے میں برسوں سے دہرا رہا تھا اور اب تک دہرائے چلا جا رہا ہوں (طلوعِ اسلام نے)۔ اور تو اور قائدِ اعظمؒ سے بھی یہی کہا تھا۔ اس نے ان کی خدمت میں گذارش کی تھی کہ (غیر منقسم) ہندوستان میں ہمارا

مطالبہ یہ تھا کہ اس ملک میں بسنے والے مسلمان، دین کے اشتراک کی بناء پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں اور مسلم لیگ اس قوم کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہم نے اس مطالبہ کی صداقت کی بناء پر مملکت حاصل کر لی۔ اب صورت یہ ہے کہ پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں۔ اس قوم کے اندر سیاسی پارٹیاں اسلام کے خلاف ہیں۔ اس لئے یہاں مسلم لیگ کو ختم کر دینا چاہیئے۔

لیکن ہمارے ہاں صورت عجیب ہے۔ یہاں اسلامی حکومت آج تک قائم ہی نہیں ہوئی۔ غیر اسلامی حکومت میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ فلاں بات اسلامی ہے اور فلاں غیر اسلامی لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ اسلام کی جزئیات اور جس حد تک کسی کے مفید مطلب ہوتی ہے، وہ اس کے متعلق ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیتا ہے کہ وہ اسلامی ہے اور فریق مخالف کے مسلک کو غیر اسلامی قرار دے کر عوام کو اس سے برگشتہ کر دیتا ہے۔ یہاں ہو یہ رہا ہے کہ جو لوگ سیاسی پارٹیوں کو خلافِ اسلام قرار دیتے ہیں وہ بھی اس حکم خداوندی کو سیاسی پارٹیوں تک محدود رکھتے ہیں، مذہبی فرقوں کے متعلق کوئی نہیں کہتا کہ وہ بھی خلافِ اسلام ہیں۔ یہ، وہ ثنویت ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے یہ وعید دی ہے کہ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) "کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ جو کوئی بھی تم میں سے ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا میں ذلیل و خوار ہوگا، اور آخرت میں عذاب شدید میں مبتلا" ــــــ خدا کی اس وعید کی صداقت کی عملی شہادت تو ذلت و خواری کی وہ زندگی ہے جسے تمام مسلمان اقوام بسر کر رہی ہیں۔

واضح رہے کہ چونکہ پاکستان کا خطۂ زمین اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی مملکت قائم ہو، قرآن مجید کا طالب العلم اور مبلغ ہونے کی جہت سے میرا فریضہ ہے کہ میں بتاتا رہوں کہ وہ کون سے عناصر ترکیبی ہیں جن سے ایک مملکت یا حکومت اسلامی قرار پاتی ہے۔ یہاں ہو یہ رہا ہے کہ کوئی حکومت ان عناصر میں سے کسی ایک عنصر کو (جو اس کے مفید مطلب ہو) اپنا کر اپنے آپ کو اسلامی قرار دے لیتی ہے۔ یہ روش یکسر خلافِ اسلام ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (۲/۲۰۸) "اسلام میں کلیتہً۔ پورے کے پورے داخل ہو"۔ لہٰذا اگر اسلام کو قبول کرنا ہوگا تو پورے کا پورا قبول کرنا ہوگا۔ اسے جزءً قبول نہیں کیا جا سکے گا۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ محض سیاسی پارٹیوں کو معدوم قرار دے دینے سے حکومت اسلامی ہو جاتی ہے یا تو وہ خود فریبی میں مبتلا ہوگا، اور یا ابلہ فریبی کے جرم کا مرتکب۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ صدر مرحوم سے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ خود طلوعِ اسلام کے اس زمانے کے فائل اس پر شاہد ہیں۔

پارلیمانی نظام،

اب آیئے اس آخری اور اہم سوال کی طرف کہ پارلیمانی یا صدارتی نظام کے متعلق میں نے صدر مرحوم سے کیا کہا تھا۔

پارلیمانی یا صدارتی نظام، اسلام کے سیاسی نظام کا ایک جزو یا یوں کہیے کہ اس کے طریق کار کا ایک حصّہ ہے۔ اصل سوال اسلام کے سیاسی نظام کا ہے۔ اس کے متعلق میں نے صدر مرحوم سے وہی کچھ کہا تھا جو میں پچاس سال سے کہتا چلا آ رہا ہوں۔ تحریک پاکستان کے دوران طلوعِ اسلام نے نیشنلسٹ علماء کے خلاف جو محاذ قائم کیا تھا تو اس اختلاف کا بنیادی مسئلہ یہی تھا۔

جیسا کہ قارئین (بلکہ اب تو یوں کہیے کہ ایک دنیا) کو معلوم ہے، اسلامی مملکت کے بنیادی اصول حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ اسلام میں حکمرانی صرف کتاب اللہ کی ہے

۲۔ کتاب اللہ میں کچھ احکام، متعین شکل میں دیئے گئے ہیں، اور زندگی کے دیگر امور کے متعلق اصولی ہدایات ہیں۔

۳۔ ان احکام کے نافذ کرنے کے طور طریق اور اصولی ہدایات کی عملی جزئیات امت کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گی۔ قرآن کے احکام و اصول ابدی طور پر غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان کے نافذ کرنے کے طریق اور اصولوں کی جزئیات، زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔

۴۔ اس مشاورت کا طریق امت خود متعین کریگی۔ لیکن طریق کوئی بھی ہو، اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ مشاورت کے فیصلے، قرآنِ کریم کی غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے کئے جائیں گے۔ پارلیمانی یا صدارتی نظام دورِ حاضرہ کے طریق ہیں۔ اگر مذکورہ شرط کی پابندی کی جائے تو ان میں سے (حسبِ حالات) جو نظام بھی مناسب سمجھا جائے اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

یہ تھا اسلامی مملکت کا وہ تصوّر جسے میں شروع سے پیش کرتا چلا آ رہا تھا اور جسے (صدر) مرحوم کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔ طلوعِ اسلام کے فائل اس کے شاہد ہیں۔ مثلاً اسکی اشاعت بابت اپریل ۱۹۵۹ء میں، اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہ پاکستان کا آئین کس انداز کا ہونا چاہیئے کہا گیا تھا کہ:۔

آئین درحقیقت نام ہے اس راستے کا جس پر چل کر، یا ان حدود کا جن کے اندر رہتے ہوئے، مملکت اپنی منزل تک پہنچتی ہے۔ یہ حدود وہ مستقل اقدار ہیں جنہیں قرآن

غیر متبدل اصولِ زندگی کے طور پر دیتا ہے۔ ان مستقل اقدار کی روشنی میں اسلامی آئین کا مرتب کر لینا کچھ بھی مشکل نہیں رہا۔ (یاد رکھئے قرآن عام طور پر اصولی ہدایات دیتا ہے، ان کی جزئیات سے بحث نہیں کرتا۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں، لیکن ان کے تابع مرتب کردہ جزئیات زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ باہمی مشاورت سے بدلی جا سکتی ہیں (ص۱۱)

اس سے اگلے صفحہ پر لکھا تھا:-

مشاورتی نظام:-

(اسلامی مملکت میں) قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں، قوانین سازی کا فریضہ نمائندگانِ ملت کے سپرد ہوگا۔ اور ان قوانین کی تنفیذ کا کام حکومت کے سپرد (ص۱۲)

اس تفصیلی بحث کو سمیٹتے ہوئے آخر میں کہا گیا تھا:-

اسلامی آئین، قرآن کے غیر متبدل قوانین (مستقل اقدار) کے مطابق مملکت کا منتہیٰ و مقصود متعین کرے گا اور اس کے حصول کے لئے حدود و شرائط کی نشاندہی کرے گا۔ ان حدود و شرائط کے اندر رہتے ہوئے عملی اقدامات ملت کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے۔ (ص۱۲)

اس کے بعد، طلوعِ اسلام کی قریب قریب ہر اشاعت میں، ان امور کی وضاحت کی جاتی رہی۔ (مثلاً) اس کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۵۹ء میں کہا گیا:-

نظم و نسقِ مملکت کا جو تصور قرآن پیش کرتا ہے۔ اس کی رُو سے حکومت کسی خاص گروہ یا پارٹی تک محدود ہو کر نہیں رہتی۔ اس کا دائرہ ساری ملت کو اپنے اندر لے لیتا ہے۔ اس نے جب کہا ہے کہ تم دنیا بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کیلئے پیدا کیا گیا ہے تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو" تو اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ (جس کے لئے اسلامی مملکت وجود میں آتی ہے) ساری اُمت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے، نہ کہ کسی خاص پارٹی کا۔ اس لئے وہی حکومت اسلامی کہلائے گی جس میں ہر فردِ مملکت کسی نہ کسی شکل میں شریکِ حکومت ہو (ص۴)

(مرحوم صدر نے) ۱۲ دسمبر ۱۹۵۸ء کو لاہور میں پیش کردہ ایک ایڈریس کے جواب میں کہا تھا:-

اکتوبر کے انقلاب کا فلسفہ وہی تھا جو پاکستان کی تخلیق کا موجب بنا تھا۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے (اپنی اشاعت بابت دسمبر ۱۹۵۹ء میں) لکھا تھا کہ،

"وہ کونسا فلسفہ تھا جو پاکستان کی تخلیق کا موجب بنا تھا، اس کی وضاحت خود بانیٔ تحریکِ پاکستان (قائداعظمؒ) نے کر دی تھی، جب انہوں نے، حیدرآباد (دکن) میں اس استفسار کے جواب میں

کہ اسلامی حکومت کسے کہتے ہیں، فرمایا تھا:

اسلامی حکومت:-

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے اصول متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے (ص ۷)

یہ ہے وہ جو میں نے (صدر مرحوم سے) کہا تھا۔ اگر الطاف گوہر صاحب اپنی کتاب میں ان حقائق کو بیان کرنے کے بعد کوئی بات مجھ سے منسوب کرتے ہیں، تو وہ صحیح تاریخ ہوگی۔ اگر ان سے اعراض برت کر، یونہی اِدھر اُدھر سے کوئی ایک آدھ فقرہ نقل کر دیتے ہیں تو وہ تاریخ نہیں تحریف کہلائیگی۔ صدر مرحوم نے میرے پیش کردہ قرآنی حقائق کا کس قدر اثر لیا تھا اس کا اندازہ ان کی ان تقاریر سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً کیں۔ مثلاً انہوں نے دستورِ پاکستان کے سلسلہ میں کہا تھا:

جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے، پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا لیکن (یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ) اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات، تفصیلات اور طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔

(پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۵۹ء بحوالہ طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۷)

انہوں نے ۲ دسمبر ۱۹۵۹ء کو ملتان میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:-

مجھے یقین واثق ہے کہ ہمارے لئے جمہوریت نہایت ضروری ہے (ایضاً)

ہم نے فوراً اس کی وضاحت کی کہ:

جمہوریت:-

اسلامی جمہوریت کے معنی ہیں، قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے حالات کے مطابق امت کے مشورہ سے جزئی قوانین مرتب کرنا

(طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۷)

انہوں نے جیکب آباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

ملک کو جمہوری نظام کی ضرورت ہے لیکن اس میں سیاسی پارٹیاں نہیں ہونی چاہئیں۔
(ڈان۔ مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۵۹ء)

میں مارشل لاء کو ختم کر کے، ملک میں اسلامی جمہوری نظام کے قیام کا کس قدر متمنی تھا اس کے لئے (حسنِ اتفاق سے) ایک خارجی شہادت بھی سامنے آگئی ہے۔ ممتاز صحافی (مولوی) محمد سعید صاحب کی ایک مدام تازہ و شاداب کتاب ہے جس کا عنوان ہے۔ آہنگ بازگشت۔ اس میں انہوں نے (صدر ایوب کے دورِ حکومت کا تذکرہ کرتے ہوئے) لکھا ہے:

> کچھ ہی دن گزرے کہ پچھلے پہر، غلام احمد پرویز، سعید صاحب سے ملنے آئے، کہنے لگے جمہوریت کی بحالی کی بات زیادہ عرصہ تک ان کبھی نہ رہنے دیجئے۔ کہ ڈر ایلئے کہ مارشل لاء کو سیاست کے اصطبل خانوں کی صفائی کے بعد جمہوریت کی طرف لوٹنا چاہیئے۔ اس ضمن میں صدر ایوب کا وعدہ دھرانے کے قابل ہے (ص ۳۷۴)

صدر مرحوم، شخصی حکومت یا ڈکٹیٹر شپ کے کس قدر خلاف تھے اس کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے لگ سکتا ہے کہ:

> کسی ایک فرد پر بھروسہ کر لینا خطرناک ہوتا ہے۔ آپ اس وقت مجھ سے مطمئن ہو سکتے ہیں لیکن اگر کل کو (خدا نکردہ) مجھے کچھ ہو گیا تو وہ مشینری کہاں ہے جو تمہیں اس کی ضمانت دے سکے کہ میرا جانشین، قاعدے اور قانون کے مطابق میرا جانشین بنے گا۔ ورنہ کوئی فتنہ برپا نہیں ہو جائے گا۔
>
> (ڈان مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۵۹ء، بحوالہ طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۶۰ء ص ۹)

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ ہماری سب سے بڑی بدنصیبی ہے کہ آج تک نہ تو پاکستان کی کوئی قابلِ اعتماد تاریخ مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی قائداعظمؒ کی کوئی مستند سوانح حیات۔ جس کسی نے جب بھی ایسی تاریخ مرتب کرنے کا عزم کیا، اسے طلوعِ اسلام کے فائلوں میں بڑا مستند مواد مل سکیگا جو کچھ ان چند صفحات میں میں نے لکھا ہے، میرا خیال ہے کہ وہ ملک کے بیشتر طبقہ کے علم میں پہلی بار آیا ہوگا۔

صدر مرحوم کے اسلامی آئین کے متعلق جو خیالات تھے، ان کی خفیف سی جھلک سابقہ سطور میں آپ کے سامنے آچکی ہے۔ تفصیل ان کی ان تقاریر میں ملے گی جو انہوں نے وقتاً فوقتاً کیں۔ ان کے دورِ حکومت کے دوران میرا ان سے رابطہ رہا۔ میں اپنے ذاتی اندازہ کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی نظام کے بارے میں وہ جو کچھ کہتے تھے، اس میں مخلص تھے۔ یہ ہماری (اور خود ان کی بھی) انتہائی بدنصیبی ہے کہ وہ اسے بروئے کار نہ لا سکے۔ میں اس دور کی تاریخ نہیں لکھ رہا کہ تفصیل سے بتاؤں کہ اس کی وجوہات کیا تھیں۔ لیکن اس کی بنیادی وجہ مذہب کے نقاب

ہیں ان کے خلاف وہ شور انگیز پراپیگنڈا تھا جس سے (ایک وقت تنگ آکر) انہوں نے کہا تھا کہ:

اب ایک، اوروں سے زیادہ مکار شخص مذہب کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آگیا ہے۔
یہ شخص سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔

(روزنامہ امروز، مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۶۳ء)

مخالفت:۔

ایک صدر ایوب (مرحوم) کے شکستِ عزائم ہی کی بات نہیں، اس نقاب پوش مذہب نے ملک میں کوئی تعمیری کام ہونے ہی نہیں دیا۔ ان کی مخالفت کسقدر حدود فراموش ہوتی ہے، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ صدر مرحوم نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ:

اپوزیشن کے راہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جا رہے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر اسلام میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے، جسطرح خدا اور رسولؐ کی منشا تھی، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ میں نے علماء سے ہمیشہ کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کریں اور اس کی منظوری وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اسے اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کی منظوری بھی حاصل کر لیں، اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون نافذ اور رائج ہو۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہوگی۔

(نوائے وقت، مورخہ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء)

ہر غیر جانبدار شخص تسلیم کرے گا کہ مذہبی پیشوائیت کو اس پر لبیک کہنا چاہیئے تھا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کا ردِ عمل کیا تھا۔ محترم مودودی (مرحوم) نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ:

یہ شخص بدنیت ہے اور علماء کے اختلاف کو خواہ مخواہ سپر بنا رہا ہے۔

(نوائے وقت مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۶۹ء)

(ضمناً) روزنامہ جنگ (لاہور) کے ۲ دسمبر لغایت ۸ دسمبر ۱۹۸۳ء کے میگزین ایڈیشن میں (کالعدم) جماعت اسلامی کے ایک (سابق) قائد لیڈر، پیر محمد اشرف صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس کے دوران انہوں نے کہا ہے:

میں پہلی بار انکشاف کر رہا ہوں کہ ایوب خان نے مارشل لاء لگانے کے بعد آئین کو اسلامی بنانے کے لئے تمام دستاویزات مولانا مودودی کے پاس بھجوا دیں اور کہا کہ "آپ مجھے اسلامی آئین بنا کر دے دیں، میں اسے ملک میں نافذ کر دوں گا۔" مولانا مودودی نے رفقاء کی ایک میٹنگ بلائی جس میں اس مسئلہ پر غور کیا گیا) میں نے اس میٹنگ میں کہا تھا کہ جماعت کو اس پیشکش کو قبول کر لینا چاہیئے ... ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر

اسلامی دستور بنا کر دے دینا چاہیئے تاکہ ملک میں اسلام نافذ ہو سکے۔ افسوس میری بات نہ مانی گئی۔ مولانا نے کہا "چونکہ ایوب غیر آئینی طریق پر حکمران بنا ہے، اس لئے اس کے ساتھ اس قسم کا تعاون نہیں ہو سکتا" چنانچہ تمام دستاویزات واپس کر دی گئیں۔ اسطرح ایوب خاں سے جماعت اسلامی کا اختلاف شروع ہو گیا حتیٰ کہ یہ اختلاف اس حد تک بڑھ گیا کہ "اگر کنونشن مسلم لیگ کا فرشتہ بھی ہو گا تو اس کو ووٹ نہیں دیا جائیگا"

اس کے ساتھ ہی مرحوم مودودی صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ "اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری حمایت حاصل ہو گی"۔

پیر محمد اشرف صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ "اسوقت سمجھا یہ گیا کہ ایوب خاں کو ہٹا کر خود اسلامی نظام نافذ کیا جائیگا"

پیر صاحب نے کہا ہے کہ (مرحوم) مودودی صاحب نے ایوب خاں (مرحوم) کی پیشکش مسترد کرتے ہوئے کہا تھا کہ "چونکہ وہ غیر آئینی طریق پر حکمران بنا ہے اس لئے اس سے تعاون نہیں کیا جا سکتا" اور تاریخ نے اپنے صفحات میں یہ واقعات بھی محفوظ کر رکھے ہیں کہ میاں طفیل محمد صاحب نے، یحییٰ خان (مرحوم) کے متعلق کہا تھا کہ وہ خلافت راشدہ کے اس رشتے کو استوار کرے گا جو حضرت علیؓ کے زمانے میں منقطع ہو گیا تھا۔ اور مودودی (مرحوم) نے صدر ضیاء الحق صاحب کے نافذ کردہ قوانین حدود کے متعلق کہا تھا کہ ان کی خلاف ورزی کرنا، خدا اور رسول کے قانون کو توڑنا ہے۔ اس سے آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

(ایشیا۔ ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء)

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق!

بہرحال بات (مرحوم) مودودی صاحب کی طرف سے (مرحوم) ایوب خان کی مخالفت کی ہو رہی تھی۔

صدارتی انتخاب:

ان حضرات کی مخالفت کس حد تک آگے چلی جاتی تھی، اس کا مظاہرہ، صدارتی انتخاب کے زمانے میں نکھر کر ہوا۔ قارئین کو معلوم ہے کہ صدر ایوب (مرحوم) کے مقابلہ میں، محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) منصب صدارت کے لئے بطور امیدوار کھڑی ہوئی تھیں (مرحوم) مودودی صاحب، عورت کے سیاست میں دخل دینے کو یکسر خلاف اسلام قرار دیتے تھے۔ ان کا ارشاد تھا:۔

یہ اسمبلی دستور ساز کی رکنیت کا حق عورتوں کو دینا مغربی قوموں کی اندھی نقالی ہے۔ اسلام کے اصول اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ اسلام میں سیاست اور انتظام ملکی کی ذمہ داری صرف مردوں پر ڈالی گئی ہے۔ اور یہ فرائض عورتوں کے دائرہ عمل سے خارج ہیں۔ (دستوری تجاویز نمبر۔ بحوالہ طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۶۴ء)

ماہنامہ ترجمان القرآن کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۵۲ء میں مرحوم نے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کرنے کے بعد کہا تھا کہ اسلام میں عورت کسی حیثیت سے بھی سیاست میں دخل نہیں دے سکتی۔ اس کے باوجود یہ جماعت محترمہ (مرحومہ) کی تائید میں اٹھ کھڑی ہوئی، اور جب ان پر یہ اعتراضات وارد ہوئے کہ اس سے پہلے انہوں نے عورت کے سیاست میں حصہ لینے کو حرام قرار دیا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ :-

اب کافی غور اور مشورے کے بعد جماعت جس نتیجہ پر پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں سے بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت سے تبدیل نہیں ہو سکتی۔ اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب یہ واضح ہے کہ عورت کو امیر بنانے کی ممانعت ان حرمتوں میں سے نہیں ہے جو ابدی اور قطعی ہیں، بلکہ دوسری قسم کی حرمتوں ہی میں اس کا شمار ہو سکتا ہے۔ (جماعت کیطرف سے شائع کردہ پمفلٹ)

اس کے بعد انتخابی مہم شروع ہوئی تو مودودی (مرحوم) دونوں امیدواروں کے تقابل میں اس حد تک آگے چلے گئے کہ انہوں نے لاہور کے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا :-

صدارتی امیدوار کے سلسلہ میں جماعت نے بڑے نپے تلے الفاظ میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کر دی تھی، عام حالات میں اصول کے مطابق صدر مرد ہی ہونا چاہیئے لیکن اصل چیز جمہوریت کی بحالی ہے۔

اگر ایک طرف کسی امیدوار میں اس کے سوا کوئی
خامی نہ ہو کہ وہ عورت ہے اور دوسری طرف مرد
امیدوار میں اس کے سوا کوئی خوبی نہ ہو کہ وہ مرد ہے۔

تو اس صورت میں اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا کہ خاتون امیدوار کی حمایت کی جائے۔ (ایشیا مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۴ء)

جب تعصب اس حد تک متشدد ہو جائے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صدر مرحوم کے خلاف پراپیگنڈہ کی نوعیت کیا ہو گی،

مودودی (مرحوم) نے کہا تھا کہ محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) میں اس کے سوا کوئی خامی نہیں تھی کہ وہ عورت تھی (صدر) ایوب اور محترمہ موصوفہ دونوں مرحوم ہو چکے ہیں۔ انتخاب کا قصہ بھی داستانِ پارینہ بن چکا ہے۔ ان کی خوبیاں اور خامیاں بھی ان کے ساتھ گئیں۔ اس لئے ان کے تذکرہ کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن مودودی (مرحوم) کے مندرجہ بالا بیان کے سلسلہ میں اس کا اظہار خلاف محل نہ ہو گا کہ انہی محترمہ کے متعلق اس سے پہلے یہی مودودی صاحب کیا فرمایا کرتے تھے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ محترمہ موصوفہ حیدر آباد (سندھ) کی مجلس اسوۂ رسولؐ کی دعوت پر میلاد النبیؐ کے جلسہ میں

شرکت کے لئے تشریف لے گئیں۔ اس پر ترجمان القرآن بابت جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۵۰ء میں لکھا گیا
لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس مجلس اسوۂ رسولؐ نے اسوۂ رسولؐ بیان کرنے
کے لئے جس عالمۂ کتاب و سنت اور پیکرِ اسوۂ رسولؐ کو دعوت دی تھی وہ مس فاطمہ جناح
ہیں۔ چنانچہ اخبارات نے غالباً موصوفہ کی پیروی اسوۂ رسولؐ ہی کو نمایاں کرنے کے لئے
ان کی تقریر کے ساتھ ان کی تصویر بھی شائع کی ہے تاکہ مسلمان خواتین اپنی آنکھوں سے
دیکھ سکیں کہ اسوۂ رسولؐ دراصل یہ ہے جس پر ملاؤں نے پردہ ڈال دیا تھا اور جو
پاکستان بننے کے بعد اب بے نقاب ہو کر سامنے آیا ہے۔ (ص ۱۱۱)

اس کے بعد محترمہ موصوفہ کی تقریر وغیرہ پر تنقید کے ساتھ ان کے پردہ کے متعلق نہایت طنزیہ انداز میں لکھا گیا تھا کہ ماڈرن مسلمان یہ کہتے ہیں کہ:۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی بیٹی پردہ کرتی تھیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ
قائداعظمؒ کی بہن پردہ نہیں کرتیں۔ ہمارے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے ہمارے
لئے قابلِ اتباع نمونہ قائداعظمؒ کی بہن کا ہے نہ کہ رسول اللہؐ کی بیٹی کا۔ (ایضاً ص ۱۱۱)

اب انتخاب کے دوران وہی مس فاطمہ جناح تھیں اور وہی ان کی بے پردگی، لیکن اب ان میں انہیں کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی۔ ایں نے یہ واقعہ باصد دلِ ناخواستہ سپردِ قلم کیا ہے!

بات چھڑ گئی ہے تو صدر ایوب (مرحوم) کے متعلق ایک تاثر بے ساختہ نوکِ قلم پر آگیا ہے جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا۔ صدر مرحوم کے نزدیک صدارتی انتخاب کی بڑی اہمیت تھی۔ اس سلسلہ میں اس مسئلہ نے بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی کہ اسلام کی رُو سے عورت سربراہ مملکت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یہ فیصلہ کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، صدر مرحوم کے لئے بڑا باعث تقویت تھا۔ ملک کے ایک خاصے طبقہ کی آنکھیں طلوعِ اسلام کی طرف لگ رہی تھیں۔ اس نے لکھا کہ قرآن کی رُو سے عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی کوئی ممانعت نہیں، سوال ذاتی اہلیت کا ہونا چاہیئے (طلوعِ اسلام نومبر ۱۹۶۴ء ص ۱۱) ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ صدر مرحوم کے خلاف جاتا تھا۔ لیکن ان کی کشادہ نگہی قابلِ تحسین ہے کہ اس سے ان کے ماتھے پر خفیف سی شکن بھی نہ ابھری اور میرے ساتھ ان کے روابط میں کوئی فرق نہ آیا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، صدر مرحوم کی وفات کے بعد یہ پہلا موقعہ ہے کہ طلوعِ اسلام میں ان کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ سیاست سے قطع نظر، بحیثیت انسان میں نے ان کی شخصیت کو بڑا قد آور پایا تھا۔ اس کی تائید میں میرے ذہن میں کئی واقعات محفوظ ہیں۔ ان میں ایک ایسا ہے جس کا اس مقام پر تذکرہ برمحل نظر آتا ہے۔

تحریکِ پاکستان میں حسبِ استطاعت حصہ لینے، اور قائداعظمؒ مجھ پر جو شفقت فرماتے تھے اس کی وجہ سے ان حضرات سے میری کافی راہ و رسم تھی جو تقسیم ہند سے پہلے مسلم لیگ کے

اعیان تھے اور جن میں سے اکثر تشکیل پاکستان کے بعد صاحبِ اقتدار و اقتدار ہوئے۔ میں نے ان میں سے کسی سے کبھی کوئی طلب و فرمائش نہیں کی۔[1] حتیٰ کہ تقسیم کے وقت، خود قائداعظمؒ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میں پاکستان میں جونسی کرسی چاہوں اپنے لئے منتخب کر لوں۔ میں نے بصد شکریہ معذرت چاہی اور عرض کیا کہ جو کرسی اسوقت میرے پاس ہے میں اسی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اس سے زاید مجھے کچھ مطلوب نہیں۔ صدر ایوب (مرحوم) سے میرے خاص روابط تھے۔ لیکن میں نے ان سے بھی کبھی کچھ نہیں مانگا تھا (جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے۔ وہ میرے لٹریچر میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ (ایک آدھ بار ایسا ہوا کہ انہیں میری کوئی کتاب خاص طور پر پسند آئی تو انہوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس کی اشاعت وسیع تر ہو، اس کے لئے میں اپنی طرف سے بطور اعانت کچھ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں نے ان سے بھی نہ کچھ لیا نہ مانگا) اس میں البتہ ایک استثنا ہوئی۔

ایک درخواست

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے، تشکیل پاکستان کے بعد میں نے یہاں کے ارباب حل و عقد سے کہا کہ نوجوان نسل کی تعلیم نو کا انتظام اشد ضروری ہے اس کے بغیر پاکستان کی ترقی تو ایک طرف اس کا استحکام بھی مشکل ہو جائے گا۔ ان میں سے ہر ایک نے مجھ سے اتفاق کیا لیکن عملاً کسی نے کچھ نہ کیا۔ بارِ تھک کر میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے لئے (چھوٹے سے پیمانے پر ہی سہی) خود ہی قدم اٹھاؤں۔ قرآنک کالج کے قیام کی سکیم اس سلسلہ میں قدم اول تھا۔ کالج کی عمارات کے لئے قطعہ زمین کا حصول ضروری تھا۔ اس کے لئے میں نے صدر مرحوم سے درخواست کی ——— ارباب اقتدار سے زندگی میں پہلی اور آخری درخواست ——— متفق وہ پہلے ہی تھے۔ اس لئے مجھے اطمینان تھا کہ زمین مل جائیگی اور کالج قائم ہو جائے گا ——— لیکن ہوا کچھ نہ۔ میرے لئے بھیک منگوں کیطرح پیچھے پیچھے پھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

بلند نگہی:

صدر مرحوم کے دورِ اقتدار کا آخری زمانہ تھا۔ ایک دن ایوانِ صدر میں، ہم دونوں کے علاوہ خواجہ شہاب الدین (مرحوم) بھی تشریف فرما تھے۔ میں نے دیکھا کہ صدر مرحوم کسی گہری سوچ میں

---

[1] ایک دفعہ (کالعدم) جماعت اسلامی کے چودھری غلام محمد (مرحوم) نے یہ الزام تراشا کہ مرکزی حکومت نے مجھے ایک لاکھ روپے کی امداد دینی منظور کی ہے جس میں سے بیس ہزار مل چکے ہیں اور باقی ملنی تھی کہ چودھری محمد علی (مرحوم) نے وہ بقیہ بند کر دی۔ غلام محمد صاحب (مرحوم) سے اس کا ثبوت مانگا گیا تو کوئی جواب نہ بن پڑا البتہ اس کے بعد ایسی الزام تراشی کی ہمت نہ ہوئی۔ (طلوعِ اسلام فروری ۱۹۵۶ء صفحہ ۴۳)

ڈوبے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے بڑے حسرت آمیز انداز سے کہا کہ ایک عرصہ سے میں اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا ہوں۔ زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں رہی اس بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ اتفاق سے خواجہ صاحب بطور شاہد بھی موجود ہیں۔

اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ میں نے کالج کی زمین کے سلسلہ میں آپ سے وعدہ کیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اسے پورا نہ کرسکا میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں میں مجبور تھا۔

ان کی بلند نگہی کے احساس سے میری نگاہیں احتراماً جھک گئیں رہیں مشکل اتنا کہہ پایا کہ آپ کی یہ معذرت آپ کی وسعتِ قلب کی آئینہ دار ہے۔ اس کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے آپ کی مجبوریوں کا علم ہے۔ مرحوم خواجہ صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو ڈبڈبا آئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے بھی آپ سے ایک معذرت چاہنی ہے ——— (لیکن یہ ایک الگ داستان ہے جس کا صدر مرحوم سے تعلق نہیں)

جیسا کہ میں نے صدر مرحوم کے مزار پر رکھی ہوئی تعزیتوں کی کتاب میں لکھا تھا۔ بحیثیت انسان، میں نے ان کی شخصیت کو بڑا بلند پایا تھا۔ طاب لہٗ وحُسن مآب۔

آسماں اس کی لحد پہ شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

میں نے اپنے آپ کو ان تین نقاط تک محدود رکھا ہے جنہیں الطاف گوہر صاحب نے میری طرف منسوب کیا ہے۔ اگر مجھے صدر محمد ایوب (مرحوم) کے دورِ سیاست کے متعلق تفصیل سے لکھنا ہوتا تو بہت کچھ کہا جاسکتا تھا لیکن ایک واقعہ ایسا ہے جس سے صرفِ نظر کرنے کو جی نہیں چاہتا اور وہ ہے ان کی وہ ولولہ انگیز تقریر جس سے انہوں نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح قوم سے خطاب کیا تھا جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تھا انہوں نے اس حملہ کا پس منظر بیان کرتے کے بعد کہا تھا۔

پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دلوں میں لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے مقدس کلمات بسے ہوئے ہیں اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک بھارتی توپوں کے دہانے ہمیشہ کیلئے سرد نہیں پڑ جاتے۔ بھارتی حکمران نہیں جانتے کہ انہوں نے کس جری قوم کو چھیڑنے کی جسارت کی ہے۔ پاکستانی عوام جو اپنے عقائد کی سربلندی اور اپنے مقصد کی صداقت پہ کامل ایمان رکھتے ہیں اللہ کے نام پہ فردِ واحد کی طرح متحد ہو کر دشمن کے خلاف جنگ آزما ہوں گے۔ نوعِ انسان کو اللہ تعالیٰ کی یہ بشارت ہے کہ حق کا ہمیشہ بول بالا ہوگا

تقریر کے آخر میں کہا تھا۔

عزیز ہم وطنو! آزمائش کی اس ساعت میں ہمیں پرسکون رہنا ہوگا۔ ہم میں سے ہر ایک فرد کو ایک عظیم فریضہ ادا کرنا ہے جس کے لئے عقیدے کی پختگی اور والہانہ سپردگی درکار ہے خدائے بزرگ و برتر اپنی رحمتِ بے پایاں سے ہمیں کامیابی نصیب کرے گا۔ حق کی فتح ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شکست اور تباہی اس باطل کا مقدر ہے جس نے تمہاری سرحد پہ سر اٹھایا ہے۔ (طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۷۹ء)

آپ تقریر کے ان اقتباسات پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس کے ایک ایک لفظ سے کس طرح قلبِ مجاہد کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔

اور یہیں سے ایک حیرت انگیز سوال ابھر کر سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ جس شخص کے یہ نظریات اور عقائد تھے۔ اور وہ صاحبِ اقتدار بھی تھا، اس کے ہاتھوں پاکستان میں اسلام عملی شکل کیوں نہ اختیار کر سکا۔ یہ وہ سوال تھا جسے ہم نے ۱۹۶۶ء میں، انتہائی سوز و گداز کیساتھ صدر (مرحوم) کی خدمت میں، اس عنوان کیساتھ پیش کیا تھا کہ

خوش بختی دستک دے رہی ہے

اس میں ہم نے لکھا تھا:۔

یوسف زلیخا" (پنجابی) کے مصنف، مولانا غلام رسول، ایک قلبِ گداز رکھنے والے صاحبِ قلم تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ بعض مقامات پر ایسے انداز سے بات کر جاتے ہیں جس سے دل میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کا ایک مقام ہے جہاں (حضرت) یوسفؑ، مصر کے بازار میں بیچے جا رہے تھے۔ زلیخا اس سے پہلے، نادیدہ آن پہ عاشق ہو چکی تھی، اور انہیں اکثر اپنے خوابوں میں دیکھا کرتی تھی۔ وہ بھی اس منڈی میں آ نکلتی ہے اور جونہی اس کی نگاہ، اس بکنے والے غلام پہ پڑتی ہے، وہ وجد و کیف کے عالم میں کھو جاتی ہے کہ، یہ تو وہی جانِ زلیخا ہے جس کے فراق میں وہ اتنے عرصہ سے تڑپ رہی تھی ـــــ زلیخا مصر کے بہت بڑے سردار کی بیوی ہے، اس لئے دولت کی اس کے پاس کچھ کمی نہیں۔ اس منظر کشی کے بعد، مولانا غلام رسول لکھتے ہیں کہ:۔

جس نوں یار وکیندا ہووے، تے قیمت ہووے پلے
اس دے جیڈ نہ طالع کوئی، اس دے بھاگ سوائے

جسے محبوب بازار میں بکتا ملے، اور اس کی گرہ میں اسے خریدنے کے لئے دام بھی ہوں۔ اس جیسا خوش نصیب دنیا میں کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ وہ بڑا ہی طالعمند ہے۔

اب آپ بازارِ مصر سے شاہراہِ پاکستان کی طرف آ جائیے۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ مملکتِ پاکستان میں ایک عظیم (عسکری) انقلاب آیا، اور زمامِ اقتدار سیاسی مدبروں کے قبضے سے نکل کر، ایک مردِ کار زار کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس سے پہلے، دنیا کے کئی ملکوں میں فوجی انقلابات آ چکے تھے اور انکی وجہ سے قتل و غارت گری کے جو انسانیت کش واقعات رونما ہوئے تھے وہ لوگوں کی یاد میں تھے۔ اس لئے لامحالہ ہر قلب احساس سینہ میں دھک دھک کر رہا تھا کہ نہ معلوم اس بدقسمت ملک پہ کیا گذرے۔ لیکن ان کا یہ خطرہ انتہائی سکون و اطمینان میں بدل گیا۔ جب انہوں نے دیکھا، کہ یہ انقلاب خون تو ایک طرف، پسینے کا

ایک قطرہ بہائے بغیر، عمل میں آگیا۔

اس کے بعد، بہی خواہانِ ملّت کے دلوں میں یہ خیال کروٹیں لینے لگا کہ خدا معلوم، اقتدارِ نو کے تحت مملکت کی پالیسی کیا ہو، اور پاکستان کے مستقبل کے لئے کون سے خطوط وضع کئے جائیں۔ لیکن ان قیاسات کے بادل بھی بہت جلد چھٹ گئے جب قائدِ انقلاب، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مختلف مقامات پر اپنی تقاریر اور بیانات میں اس حقیقت کو غیر مبہم الفاظ میں واضح کر دیا (اور اسے بار بار دہراتے رہے) کہ یہ نظامِ نو، اسی آئیڈیالوجی کے احیاء اور استحکام کے لئے مصروفِ کار رہے گا جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ ہم ان تقاریر اور بیانات کو اس سے پہلے بھی کئی بار پیشِ قارئین کر چکے ہیں، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا بار بار اعادہ نہایت ضروری ہے، کیونکہ اس سے وہ مقصدِ عظیم نکھر کر سامنے آجاتا ہے، جس کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا، اور وہ وعدے پھر سے مستحضر ہو جاتے ہیں جو قوم سے ہی نہیں بلکہ خدا سے بھی (بار بار کئے گئے ہیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر، ہم اس انقلاب کی سالگرہ کی تقریب پر، ان میں سے چند ایک کے اقتباسات زینتِ اوراقِ طلوعِ اسلام کرتے ہیں۔

راولپنڈی کی تقریر:

عسکری انقلاب کے چھ ہی ماہ بعد، صدر ایوب نے (۱۶ مارچ ۱۹۵۹ء کو) راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"ہمارا سب سے مقدم فریضہ یہ ہے کہ ہم اس آئیڈیالوجی کا احیاء و استحکام عمل میں لائیں جس کی رو سے پاکستان ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے وجود پذیر ہوا۔ پاکستان ایک خطۂ زمین کا نام نہیں جس میں آٹھ کروڑ نفوس بستے ہیں۔ پاکستان سے ہماری مراد ایک ایسی ملّت ہے جو مخصوص اخلاقی اور روحانی اقدار کی امین ہے۔ یہ اقدار اسلام پر مبنی ہیں۔ ہمارے تجدد پسند حضرات کے نزدیک اسلام کا نام لینا فیشن کے خلاف (اور قدامت پرستی کی دلیل) ہے۔ یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے۔ اس کے برعکس یہ امر ہمارے لئے موجبِ صد ہزار فخر و مباہات ہونا چاہیئے کہ ہم ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو ہمیں اس قسم کی بلند اقدار کی تعلیم دیتا ہے۔ مثلاً خدا ترسی، بنی نوعِ انسان سے محبت، ہمسایہ سے مودت، یتیموں کی نگہبانی اور غریبوں کی امداد۔ یہ اسلام کی وہ بنیادی اقدار ہیں جن کے بغیر نہ تم اچھے انسان بن سکتے ہو، نہ اچھے پاکستانی۔" (پاکستان ٹائمز، مارچ سنہ ۵۹ء)

کمشنرز کانفرنس مری:

اس کے ٹھیک چار ماہ بعد (۲ جولائی ۱۹۵۹ء کو) مری میں، مغربی پاکستان کے کمشنروں کی

کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

ہمارے سامنے اس وقت دو اہم مسائل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایک مشترک اسلامی آئیڈیالوجی کے تحت لوگوں میں اتحاد پیدا کریں۔ اور اس آئیڈیالوجی کی تشریح ذہنِ عصرِ حاضر کی زبان میں زمانے کے موجودہ تقاضوں کے مطابق کی جائے۔ اس آئیڈیالوجی کی روح کو اسلام سے کشید کیا جائے، اور ہمارا زمانہ جس حد تک ترقی کر چکا ہے، اس کی روشنی میں اس کی تعبیر کی جائے۔ اس وقت اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ اہلِ فکر و نظر حضرات کو دعوتِ غور و تدبّر دی جائے۔ کہ وہ زندگی کے ان مسائل کا نہایت معقول حل دریافت کریں۔ دوسرا اہم کام یہ ہے، کہ ملک کا معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر، خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس لئے اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے۔

(پاکستان ٹائمز، ۷ جولائی ۱۹۵۹ء)

دارالعلوم ٹنڈوالہ یار،

مئی ۱۹۵۹ء میں صدرِ محترم نے، دارالعلوم ٹنڈوالہ یار میں، علماء کے ایک اجتماعِ کثیر سے خطاب کیا۔ یہ خطاب اس قابل ہے کہ اس کی وسیع نشر و اشاعت ہو اور اسے بار بار دہرایا جائے۔

انہوں نے اسلام کے صدرِ اوّل کی عالمتاب انقلاب آفرینی کی یاد تازہ کراتے ہوئے فرمایا کوئی چودہ سو برس کا عرصہ ہوا کہ اسلام فضائے ہستی پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہوا۔ یہ مذہب نہیں تھا بلکہ ایک ترقی پسندانہ تحریک تھی جو اپنے زورِ دروں سے بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس نے حیاتِ انسانی کو نیا پیکر، اس کی جد و جہد کو نئی تعبیر اور کاروانِ انسانیت کو نئی منزل عطا کر دی۔

(پاکستان ٹائمز ۴ مئی ۱۹۵۹ء)

اس کے بعد انہوں نے کہا:

"جب تک یہ تحریک زندگی کا جزو بنی رہی اس کے متبعین دنیائے سائنس اور علمی علوم میں ایسے ایسے کارنامے دکھاتے رہے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ بدقسمتی سے کچھ زمانہ گذرنے کے بعد مسلمانوں نے اسلام کو نظری مذہب میں تبدیل کر دینے پر اپنی توجہات مرکوز کر دیں اور دین بحیثیت تحریک ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زندگی اور مذہب میں ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔ یہ تفریق آج تک ہماری زندگی کو متاثر کئے جا رہی ہے۔

اسلام اس تفریق (یعنی مذہب اور زندگی کی ثنویت) کو مٹانے کے لئے آیا تھا لیکن یہ فطرت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ خود اسلام کے متبعین اس ثنویت کا شکار ہو کر رہ گئے۔" (ایضاً)

انہوں نے مزید وضاحت فرمائی کہ:۔

"جب زندگی اور مذہب کا رشتہ منقطع ہو جائے تو زندگی بہرحال کسی نہ کسی سمت چلتی رہتی ہے۔ لیکن مذہب ایک ایسی بے جان شئے بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ لوچ اور لچک باقی رہتی ہے، نہ حرکت اور نمو کی صلاحیت، یہ جامد اور متحجر مذہب (زندگی کے دوش بدوش چلنے کے بجائے) مسجدوں اور خانقاہوں میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ بھی ہوا۔ انسانیت، سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرتے کرتے کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہے، لیکن ہمارا مذہب ایک ہی مقام پہ ساکت وصامت کھڑا ہے۔ اسلام کا معجزہ یہ تھا کہ اس نے بت پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو بُت بنا دیا۔" (ایضاً)

اس کا خطرناک انجام واضح کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:۔

"مذہب کو یوں بت بنا دینے کا ایک خطرناک نتیجہ، جس نے ہماری ملی ذہنیت اور ثقافت پہ تباہ کن اثر ڈالا ہے، یہ تھا کہ جن لوگوں نے عصرِ حاضر کی بڑھتی ہوئی ترقیوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے قدم اٹھایا، ان پہ "دنیا دار مسلمان" کی مہر ثبت کر دی گئی اور جو لوگ مذہبی رسومات و روایات کی آڑ لے کر ماضی کی دنیا میں جمود وسکون کے مجسمے بن کر رہ گئے وہ سچے اور اور پکے مسلمان کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ مستقبل کی طرف نگاہ رکھ کر شاہراہِ حیات پر آگے بڑھنے والے، اسلام سے منحرف اور برگشتہ شمار ہونے لگے اور ماضی کی طرف دیکھنے والے مقدس دیندار قرار پا گئے۔ ہر نئے اقدام، ہر نئی ایجاد، ہر نئی تعلیم کے متعلق یہ شور بپا کر دیا گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں ہر انقلابی راہ نما کے خلاف کفر کے فتوے لگتے رہے ہیں۔" (ایضاً)

اپنے اس دعوے کی شہادت پیش کرتے ہوئے صدرِ مملکت نے علمائے کرام کو دعوت فکر دی کہ:۔

"میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ذرا ان خطبات کا خالی الذہن ہو کر جائزہ لیں جو ہمارے ملک کی ہر مسجد میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ موجودہ زمانہ کی چھوٹی سے چھوٹی بات پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ بات نئی ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے کہ اس قسم کے بلند اور باعزت دین کو ترقی کا دشمن، علم و بصیرت کا حریف بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ صرف اسلام کے ساتھ ہی ظلم نہیں، ہمارے ان نوجوانوں کے ساتھ بھی ظلم ہے جو آج کل کی ماڈرن دنیا میں مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز زندگی اور مذہب دونوں کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے کہ بیسویں صدی کے انسان پر یہ پابندی عائد

کر دی جائے کہ اگر اسے اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنا ہے تو اسے کئی سو برس پیچھے جانا پڑے گا۔" (ایضاً)

اس کے بعد صدرِ مملکت نے کہا کہ غور طلب بات یہ ہے کہ اسلام جیسا ترقی پسند، زندہ دین اس قسم کا جامد مذہب کیسے بن گیا؟ اس کے جواب میں، انہوں نے پہلے اس کی چند وجوہات استفہامیہ انداز میں خود ہی بیان کیں، انہوں نے کہا:

(۱) کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقیقی نصب العین سے بھٹک گئے اور ایسا معاشرتی اور سیاسی نظام وضع کرنے میں ناکام رہے ہیں جو بدلتے ہوئے تقاضوں اور تغیر پذیر قدروں کے ساتھ چلنے کی سکت رکھتا ہو؟

(۲) یا ہم نے اپنے دین کو جنوں اور فرشتوں کی کہانیاں بنا کر، اسے توہم پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ اور اندھی تقلید کا نعرہ بلند کر کے انسان کی تخلیقی آرزوؤں کا راستہ روک دیا ہے۔

(۳) یا اس کی وجہ وہ تصوف ہے جس نے (زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے) ہم میں فرار کی ذہنیت پیدا کر دی ہے اور زندگی کو قبروں اور حجروں میں محبوس کر دیا ہے،

(۴) یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یہ غلط عقیدہ وضع کر رکھا ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اگلی دنیا میں نجات کے حقدار بن سکتے ہیں۔ کیا ہم اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی ہماری اس زندگی کے اعمال کا ثمر ہے، اور ہم جنت میں وہی کاٹیں گے جو کچھ ہم دنیا میں بوئیں گے۔" (ایضاً)

ان سوالات کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے علماء حضرات کو ایک اہم مشورہ دیا اور فرمایا کہ:

"یہ سوالات بہت اہم ہیں اور ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم ان عناصر کی جڑ کاٹ لگائیں جنہوں نے اسلام کی برق آسا، شعلہ صفت روح کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ اس تحقیق میں ہمارے سامنے بہت سی ایسی حقیقتیں آئیں گی جو نہایت تلخ اور ناخوشگوار ہوں گی۔ لیکن ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم تلخیوں اور ناخوشگواریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یقینِ محکم کے ساتھ بیباکانہ انداز میں سرگرم جستجو رہیں۔"

اس کے بعد صدرِ محترم نے اس خطرہ کا ذکر کیا جو اسلام کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"آج دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان کی باہمی کشمکش آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ کمیونزم تہیہ کر چکی ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی تمام دنیا پر مسلط کر دے۔ مذہب کمیونزم کا کوئی مؤثر اور مکمل جواب نہیں پیش کر سکا۔ اس لئے کہ اس کی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو اقدار مادیت سے منوار ہوتی ہیں، نظامِ کائنات میں ان کا بھی ایک مقام ہے لیکن وہ ایسی اہم نہیں کہ

نوعِ انسانی ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اندریں حالات کمیونزم کا ایک اور صرف ایک جواب ہے اور وہ جواب اسلام سے مل سکتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ اور مذہب کی مادی اقتدار (کی کشمکش) میں صرف اسلام ہی وہ فطری آئیڈیالوجی پیش کر سکتا ہے جو روحِ انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔ (ایضاً)

خطرہ کی روک تھام کے سلسلے میں انہوں نے فرمایا:۔

کمیونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر عصرِ حاضر کی روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے۔ بلکہ ایک تہذیبی، سیاسی، معاشی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔

پاک جمہوریہ کا دورہ:۔

ملک کے سامنے سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ یہاں قانون سازی کا اصول کیا ہو۔ پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے قریب بارہ برس ہو چکے تھے لیکن اس کی قانون سازی کی کشتی ایک ہی مقام پر گردش کئے جا رہی تھی۔ ساحلِ مراد کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں یہی کھٹے نہیں پا رہا تھا کہ اسلام میں قانون سازی کا اصول کیا ہے۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں، صدرِ مملکت نے ایک اسپیشل ٹرین (پاک جمہوریت) کے ذریعے ملک کے مختلف گوشوں کا دورہ کیا اور متعدد مقامات پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے ۱۷ دسمبر کو ملتان میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے، پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا۔ لیکن (یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ) اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور انکی جزئیات، تفصیلات اور طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔" (پاکستان ٹائمز ۱۸ دسمبر ۱۹۵۹ء)

یومِ انقلاب ۱۹۶۰ء:

اسی سلسلہ میں انہوں نے، ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۰ء کی شام، عسکری انقلاب کی دوسری سالگرہ کی تقریب پر ریڈیو سے قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا۔

"علامہ اقبالؒ نے جن کا شمار عصرِ حاضر میں روحِ اسلام کے بہترین روشن دماغ ترجمانوں میں ہوتا ہے، کس قدر سچی بات کہی ہے کہ اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی

اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمو تغیر اور تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ کیلئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر و تبدل کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان نہیں، وہ تغیر جسے خود قرآن نے آیات اللہ میں شمار کیا ہے تو اس سے زندگی، جو حتماً متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو سیاسی اور روحانی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ابدی اقدار پر ان کی گرفت نہیں رہی تھی۔ اور گذشتہ کئی صدیوں میں، جو اسلام کی قوت میں ضعف آیا ہے، تو اس کی وجہ یہی جمود و تعطل تھا

اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا وقت آیا ہے کہ ۹ کروڑ مسلمانوں کو اس بات کا موقعہ ملا ہے کہ وہ اپنے ایمان اور زندگی کے روز مرہ کے مسائل میں امتزاج پیدا کرنے کے پروگرام میں شریک ہو سکیں"

اسی نکتہ کی مزید نقاب کشائی کرتے ہوئے آگے چل کر فرمایا:۔

"قرآن کریم کی اہم تعلیمات سے ایک یہ بھی ہے کہ حیات ایک ترقی پذیر مسلسل عمل تخلیق ہے اس لئے ہر نئی نسل کو اس کا حق پہنچنا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل آپ تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں اپنے اسلاف (کے علمی سرمایہ) سے راہنمائی لے لیکن اسلاف کے فیصلے ان کی راہ میں روک نہیں بن سکتے"

اس کے بعد وہ قومی زندگی کے عظیم مقاصد کی طرف آئے، اور کہا:۔

ہمارے سامنے پہلا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرہ کو از سر نو منضبط کریں، اور اسلامی آئیڈیالوجی کو اس کی بنیاد قرار دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقصد تھا جو تخلیق پاکستان کے لئے وجہ جواز قرار پایا تھا۔ اس مقصد کی طرف پہلا قدم اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے قلوب و اذہان کو دو قسم کی نفسیاتی الجھنوں سے آزاد کرائیں۔ ان میں سے ایک الجھن جدید تعلیم کی پیداوار ہے۔ یہ تعلیم ہمارے دورِ غلامی میں رائج کی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہاں کی ہر شے جس میں دین بھی شامل ہے، فیشن کے خلاف سمجھی جانے لگی۔

دوسری الجھن ان جامد عقائد کی پیداوار ہے جنہوں نے دین کی روح کو تعصب، توہم پرستی، اور گلا گھونٹ دینے والے خیالات کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی دکھائی دے گی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارا یہ (نام نہاد) تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ، دونوں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور وہ پلیٹ فارم ہے "دینی جہالت" (یعنی دین کے متعلق نہ انہیں کچھ علم ہوتا ہے نہ انہیں)"

قاہرہ یونیورسٹی میں ۔ نومبر ۱۹۶۰ء میں، صدر مملکت نے ممالک اسلامیہ کا دورہ کیا اور مصر و حجاز

کے اہم مقامات پر اس قدر بصیرت افروز تقاریر کیں جن کی صدائے بازگشت آج تک وہاں کی وادیوں میں گونجتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"جوں جوں ہم دین کی روح سے دور ہٹتے گئے اور محض رسم پرستی کو دین سمجھ لیا، دین کی اصل حقیقت کی جگہ سطحیت نے لے لی، غور و فکر کی جگہ توہم پرستی آگئی اور جرأت تحقیق کی جگہ روایت پرستی کی اندھی تقلید نے سنبھال لی۔ مسلمانوں کو تاج و تخت اور حکومتوں اور سلطنتوں کے چھن جانے سے اس قدر نقصان نہیں ہوا جس قدر نقصان اس سے ہوا کہ ان سے اس دل کی حکومت چھن گئی جس کا شعار آزادانہ تحقیق و کاوش تھا۔ اور اس کی جگہ ان پر عقلی جمود مسلط ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی تو آگے بڑھتی گئی لیکن اسلام کا علم و عمل اس سے صدیوں پیچھے رہ گئے اور وہ دین جس کا مقصود یہ تھا کہ وہ ایک مکمل، متحرک اور حرکت بخش ضابطہ حیات بنے، محض پوجا پاٹ کی ظواہر پرستی کا پیکر بن کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس دنیا میں، جو ہر آن آگے بڑھتی جا رہی ہے، مسلمان کی نگاہیں مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف جاتی ہیں۔

ہمارے نظامِ تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید و جمود کے اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے اور عصرِ حاضر کے علم اور سائنٹفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسے آگے بڑھاتے جائیں"۔

(ڈان۔ ۱۵ نومبر ۱۹۶۰ء)

۷۔ نومبر کو صدرِ پاکستان کے اعزاز میں (قاہرہ میں) ہیلتھ یونین ریلی کا اجتماع ہوا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"ایک اور مسئلہ بھی ایسا ہے جو میرے خیال میں آپ حضرات کے ذہن رسا کے بھی ایسا ہی قریب ہے جیسا ہم پاکستانیوں کے، ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ترقی پسند اور متحرک دین ہے یہ ایک ایسا دین ہے جو عقل و فکر اور غور و تدبر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلنا سکھاتا ہے۔ لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس دین کے ساتھ بیتی کیا ہے۔ ایک طرف اس دین کو دیکھئے اور دوسری طرف عالم اسلام کی طرف نگاہ ڈالئے، بات نکھر کر سامنے آجائے گی۔ آج ساری دنیا کے مسلمان سب سے زیادہ پیچھے اور سب سے کم تعلیمیافتہ ہیں۔ کیا یہ صورتِ حالات ایسی تشویش انگیز نہیں کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس پر غور کریں کہ اس قسم کے دین کے نام لیواؤں کی ایسی حالت کیوں ہو گئی ہے؟ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے اور اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ہر اس مسلمان کا فریضہ ہے جسے دیدۂ بینا عطا ہوا ہے کہ وہ سوچے کہ ہمارے اس زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور جس نتیجہ پر وہ پہنچے، اسے بلا خوف اور بے دھڑک واضح الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ اور مذہبی راہنماؤں نے مشکلات و مصائب کے ہجوم

ہیں ہماری ملی روایات کے حفظ و بقاء کے لئے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ لیکن کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے ہیں، وہ اس طریق کی طرف ہماری راہنمائی کر سکتا ہے جس سے ہم زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل ہو سکیں؟ ممکن ہے آپ اس کے جواب میں کہہ دیں کہ (۱) ان کے لئے یہ بتانا کیا ضروری ہے اور (۲) ہم پر یہ بھی کب لازم ہے کہ ہم زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ قوانینِ فطرت اور خود قرآن کریم ہمیں واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو لوگ اپنے اندر تبدیلی پیدا نہیں کرتے اور زمانے کے ساتھ نہیں چلتے، آخر الامر تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم زمانے کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہونگے اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور انہیں دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے تو پھر ہم دوسروں کے غلام بن جائیں گے۔ اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس مرتبہ کی غلامی، سابقہ دور کی غلامی کے مقابلہ میں، بہت زیادہ دیرپا ہو گی۔ (ڈان۔ ۱۵ نومبر ۱۹۶۰ء)

عیدالاضحیٰ کا پیغام:

۱۹۶۱ء میں عیدالاضحیٰ کی تقریب سعید پر، صدرِ محترم نے، قوم کے نام ایک نشریہ میں فرمایا:

"بڑھتی ہوئی تعلیم اور ترقی کے اس زمانے میں زندگی کی رفتار بے حد تیز ہو گئی ہے اور انسان کا ذہن بہت سی ان حدود سے آزاد ہو گیا ہے جو بے علمی کی وجہ سے قائم تھیں۔ آج کا ذہن صرف اسی بات کو قبول کرے گا جو سائنس اور علم کے اس عجیب و غریب دور میں اسے مطمئن کر سکے۔ اگر ہم نے مذہب کو ماضی کی چار دیواری میں قید رکھا تو یہ خطرہ ہے کہ حال و مستقبل کے بہت سے لوگ لادینی کا شکار ہو جائیں گے۔

عزیز ہم وطنو! ہم لوگ اس بات پر فخر کرنے کے عادی ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر زمانے اور ہر جائز ترقی کا ساتھ دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن یہ دعویٰ صرف بیان کر دینے سے ہی ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو عملی طور پر ثابت کر کے دکھائیں۔ اس مقصد کے لئے دو باتیں بہت لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور دوسرے یہ کہ اپنے زمانے اور ماحول کی روشنی میں ان پر عمل کرنے کی راہیں تلاش کریں۔

قرآن کریم کے ابدی اصولوں کی روشنی میں جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے، اسے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں یہ وضاحت بیان فرمایا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگرچہ قرآن شریف تبرک کے طور پر پڑھا اور پڑھایا تو ضرور جاتا ہے۔ لیکن اس کو سمجھنے کی زیادہ کوشش نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے عقائد اور عمل میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی ہے۔ اصول خواہ دینی ہوں یا دنیوی، اس لئے نہیں بنائے جاتے کہ ان کو بت بنا کر ان کی

پرستش کی جائے۔ اصول تو اس لئے بنتے ہیں کہ ان پر صحیح طور پر عمل کیا جائے۔ اصول اپنی جگہ بنیادی ہوتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ لیکن اصولوں پر چلنے کے انداز ہر زمانے اور ہر ماحول کے مطابق ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو، تو علم اور عمل الگ الگ راہوں پر چلنے لگتے ہیں۔ اور ان میں کوئی رابطہ قائم نہیں رہ سکتا۔"

خواتین سے خطاب :-

انہوں نے ۲۵ دسمبر ۱۹۶۱ء کو کراچی میں خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"قرآنِ کریم نے ہمیں جو بنیادی اصول دیئے ہیں وہ ابدی ہیں۔ لیکن ان کی تشریح وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ہونی چاہیئے اور معاشرہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مقتضیاتِ زمانہ کے مطابق اُن پر عمل کرائے۔ (یاد رکھئے) صرف وہی قومیں زندہ رہ سکتی ہیں جن میں عقل و استدلال سے کام لینے کی بصیرت موجود ہے۔"

(بحوالہ "نوائے وقت" ۲۶ ستمبر ۱۹۶۱ء)

جامعہ بہاول پور میں :-

جس پریشان کن سوال نے ملک کو اس قدر وقفِ اضطراب بنا رکھا ہے، یہ ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت کا دعویٰ یہ ہے کہ جس بات کو ہم جائز قرار دیں، اُسے جائز سمجھا جائے اور جسے ہم ناجائز کہہ دیں اسے ملک و ملت کے لئے شجرِ ممنوعہ ٹھہرا دیا جائے اور اس طرح حکومت ہمارے نافذ کردہ فتاویٰ کے تابع چلے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ متھیا کریسی ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ صدرِ محترم کو اس کا شدید احساس تھا چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے (۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو) جامعہ اسلامیہ بہاول پور کا افتتاح کرتے، اپنی تقریر کے ضمن میں کہا:

"اگر موجودہ وقت کے ہمارے علماء کوئی ایسا فتویٰ دے دیتے ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں ہمیں صحیح معلوم نہیں ہوتا، تو ہمیں وہ راستہ اختیار کرنے سے کوئی چیز نہیں ہونا چاہیئے جسے ہم صحیح سمجھتے ہوں۔ قرآنِ حکیم میں بار بار کہا گیا ہے کہ ہم اپنی عقل اور دانش سے کام لیں۔ علاوہ ازیں حضور اکرمؐ نے خود اجتہاد کے دروازے کھولے ہیں۔ اگر ہم نے تنگ نظری کا ثبوت دیا اور فرسودہ طریقے اپنائے رکھے، تو ہماری مستقبل کی نسلیں اسلام سے اسی طرح دور ہو جائیں گی جس طرح مغربی اقوام اپنے مذہب سے دُور ہو گئی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمارے مذہبی راہنماؤں، اور علماء کا اخلاقی، قومی اور مذہبی فرض ہے کہ وہ اسلام کے اصولوں کو دورِ جدید کی ضروریات پر منطبق کر کے ثابت کریں کہ یہ اصول سچے اور ہر زمانے کے لئے ہیں۔ فرسودہ نظریات سے جو بدلے ہوئے حالات میں کسی کام کے نہیں ہیں، سختی سے وابستگی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہماری آئندہ نسلیں، مذہب سے دور ہو جائیں گی اور انہیں خوفِ خدا نہیں رہے گا۔ اسلام ایک ترقی پسند

مذہب ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے جو عظیم کامیابی حاصل کی وہ اسلام کے اصولوں کی سختی سے پابندی کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے زندگیوں کا آغاز غیر مہذب لوگوں میں کیا۔ وہ آرٹ، ادب اور سائنس کے ماہر اور دنیا کے رہنما بن گئے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسی اسلام کے پیروکار آج پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم صحابہؓ کرام کے نقشِ قدم پر نہیں چل رہے۔ ہم نے اسلام کے اصولوں کو ترک کر دیا ہے اور صرف اسلامی فقہ کو ہی اسلام سمجھتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک بار پھر عوام میں اسلام کی صحیح روح پیدا کی جائے۔ (کوہستان، ۱۰ نومبر ۱۹۶۳ء)

سنہ ۱۹۶۶ء میں:

بات لمبی ہوتی جا رہی ہے اس لئے اسے مختصر کرنے کے لئے ہم سنہ ۱۹۶۶ء میں آ جاتے ہیں۔ گذشتہ جولائی میں، صدر ایوب نے مجلس تزئین القرآن کا افتتاح کرتے ہوئے، راولپنڈی میں فرمایا:-

پاکستان ایک ایسی مملکت ہے جس کی بنیاد اسلامک آئیڈیالوجی پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جداگانہ ہستی کی واحد بنیاد یہ ہے کہ ہم نے اس امر کا تہیہ کر لیا کہ ہم اسلامی قوانین کے مطابق اپنی تشکیل جدید کریں گے۔ بہ حیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید خدا کی کتاب ہے اور ہماری مادی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات۔ یہ بندوں کے بندوں کے ساتھ، اور بندوں کے خدا کے ساتھ تعلقات وابستہ کرنے کے ضوابط ہی متعین نہیں کرتی، بلکہ ایک مبنی بر انصاف مملکت کے لئے اصولِ حکومت بھی عطا کرتی ہے۔ اس میں معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے انفرادی اور اجتماعی کوششوں پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ نیز اس میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق علوم حاصل کرنے کی بڑی تائید کی گئی ہے۔ قرآن نے قدیم فلسفیانہ نظریات، غیر اسلامی مذہبی عقائد اور عصرِ حاضر کے مادیانہ تصورات کا بڑی عمدگی سے مقابلہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جو بنیادی اصول دیئے گئے ہیں وہ غیر متبدل ہیں اور مسلمانوں نے ہر زمانے میں، اسے محفوظ رکھنے کی مسلسل کوشش کی ہے[سے]

(پاکستان ٹائمز، ۲۸ جولائی ۶۶ء)

خلاصۂ بحث:

صدرِ محترم کی تقاریر، خطبات، اور بیانات کے مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ حقیقت غیر مبہم

سے ان تقاریر سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ صدر مرحوم کے خیالات کس قدر انقلابی تھے، اور اسلامی مملکت کا تصور ان کے ذہن میں کس قدر واضح تھا۔

طور پر سامنے آجاتی ہے کہ وہ اپنے برسرِ اقتدار آنے کے یوم اوّل سے اس وقت تک اپنے اس ایمان اور یقین کو مسلسل اور متواتر قوم (بلکہ دنیا) کے سامنے پیش کرتے چلے جا رہے ہیں کہ:

(۱) پاکستان ایک ایسی مملکت ہے جسے اسلامک آئیڈیالوجی کو عملاً نافذ اور متشکل کرنے کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔ اس نصب العین کو ترک کر دیا جائے تو ہماری جداگانہ ہستی کی کوئی وجہ جواز نہیں رہتی۔

(۲) یہ آئیڈیالوجی قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے جو ہمارے لئے انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مکمل ضابطہ اور مملکت کے لئے غیر متبدل راہنمائی ہے۔

(۳) قرآنِ کریم کے اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ملّتِ اسلامیہ، زمانے کے تقاضوں کے مطابق، قوانین خود مرتب کرے گی۔

(۴) اسلام میں تھیاکریسی کا وجود نہیں جس میں مذہبی پیشواؤں کے فتاوے کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔

(۵) تعصب، جہالت، قدامت پرستی اور توہم انگیزی کی جو تعلیم مذہبی پیشوائیت کی طرف سے دی جاتی ہے، جب تک اس سے چھٹکارا حاصل نہ کیا جائے، ہم زندگی کی شاہراہ پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔

(۶) کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لئے، ملک کا معاشی نظام ایسی مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے جس سے ہر فردِ معاشرہ کو روٹی ملتی جائے۔ اس لئے کہ "انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے"۔

خوش بختی یا حرماں نصیبی:

یہاں سے آپ پھر بازارِ مصر کی طرف لوٹ چلئے۔ یوسفؑ سرِ بازار بک رہا ہو، زلیخا کے پاس اسے خریدنے کے لئے دام بھی ہوں، اور وہ اسے خریدے بغیر گھر واپس چلی جائے تو آپ زلیخا کی اس حرماں نصیبی کے متعلق کیا کہیں گے؟

صدرِ مملکت، محترم محمد ایوب خاں صاحب کے خیالات، نظریات، معتقدات، بلکہ ان کا ایمان، ان کی خواہشیں، ان کی آرزوئیں، ان کی تمنائیں، جن کا وہ اس شد و مد سے اظہار کرتے چلے آرہے ہیں، یہ ہوں اور پھر ان کے پاس اقتدار بھی اتنا وسیع ہو کہ جب جی چاہے انہیں عملی پیکر عطا کر دیں ـــــ پہلے چھ سال تک یہاں مارشل لاء نافذ رہا جس سے زیادہ ذی اختیار دور، تقدر میں بھی نہیں آسکتا۔ اور اس کے بعد، ملک میں صدارتی نظام قائم ہوا جس میں سربراہِ مملکت کے اختیارات کچھ کم نہیں ہوتے۔ یہ ہو اختیارات کی وسعت ـــــ لیکن اس کے باوجود، ان کے

یہ تصورات، تقاریر اور بیانات کی حد سے آگے نہ بڑھیں، تو اس کے متعلق، بجز اس کے کہ ایک سرد آہ کھینچ کر رہ جائیں، ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے جنوری ۱۹۶۱ء میں کچھ ایسے ہی احساسات کے تابع لکھا تھا۔

ہم جناب محترم المقام صدرِ مملکتِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی خدمت میں بصد ادب و احترام گذارش کریں گے کہ فطرت نے آپ کو ایک ایسے بلند مقصد کے لئے منتخب کیا ہے جس کی نظیر ہماری ہزار سالہ تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ مقصد جس کے لئے اقتدار آپ کے ہاتھوں میں منتقل ہوا ہے۔ مملکت میں صحیح اسلامی نظام کا نفاذ ہے۔ اگر یہ مقصد آپ کے ہاتھوں پورا ہو گیا تو یقین مانیں، آپ کا نام جریدۂ عالم میں سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ تاریخِ انسانیت آپ کو زمرۂ اقوام میں بلند ترین مقام عطا کرے گی۔ اور خدا اور اس کی کائناتی قوتیں آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجیں گی ———— سابقہ اربابِ حل و عقد نے فطرت کی اس عظیم و جلیل پیشکش کی قدر نہ کی ———— خدا کرے آپ ان میں منفرد ثابت ہوں اور جو مسند بلند اب تک خالی پڑی ہے، اس پہ فائز المرام ہونے کا شرف حاصل کر سکیں اور جب آپ بحضورِ داورِ داوراں جائیں تو خود اسلام آگے بڑھ کر آپ پر یہ کہتے ہوئے تبریک و تہنیت کے پھول برسائے کہ

ع "یہ ہے وہ مردِ بلند ہمت جس کی قوتِ بازو
سے زمانہ میں میرا سکہ رواں ہوا!"

آج ہم اپنی اس عرضداشت کو پھر دہراتے ہوئے، صدرِ محترم کی خدمت میں بصد ادب عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اقتدار تو ایک طرف، خود انسانی زندگی ہی کا کچھ اعتبار نہیں اور اقبال کے الفاظ ہیں:۔

ع یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ نادر موقعہ عطا کیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھایئے اور مملکتِ پاکستان میں اس قرآنی نظام کو رائج کر جایئے جسے دیکھنے کے لئے پورا عالمِ انسانیت چشم براہ ہے اس سے آپ ملتِ پاکستانیہ کی آنکھوں کے تارے، اور انسانیت کے محسنِ اعظم بن جائیں گے۔ تاریخ کے اوراق پہ آپ کے نقوشِ قدم، ابدیت در کنار ہونے کی سعادت حاصل کر لیں گے اور خدا کے ہاں آپ کا شمار اس کے صالحین کے زمرے میں ہو گا ———— آگے بڑھئے اور اس خوش نصیبی کے اس سازِ عزیمیں کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیجئے۔ "یوسف" بازار میں بار بار نہیں بکا کرتے۔ زمامِ اقتدار آپ کے ہاتھ میں آئی ہے تو خدا کے اس ارشادِ گرامی کو ہمیشہ

اپنے سامنے رکھئے کہ:-

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۴)

پھر تمہارے پیش روؤں کے بعد ہم نے زمامِ حکومت تمہارے ہاتھ میں دی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

یاد رکھئے! خدا کا اٹل قانون کسی کی رعایت نہیں کیا کرتا ـــــ لہذا

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر   زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

وائے افسوس کہ خوش بختی اُن کے دروازے پر دستک دیتی رہی لیکن وہ دروازہ نہ کھلا تو وہ منہ موڑ کر چل دی، اور پھر اس نے آج تک پلٹ کر نہ دیکھا۔ صدر مرحوم کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ

ز تیرہ بختی آئینہ حیرتے دارم   ترا کشید در آغوش و آفتاب نشد

اور اپنی حرماں نصیبی کے متعلق اس کے سوا کیا کہہ:-

اس کے دل سے پوچھئے اس کے جگر سے پوچھئے
آج جس کی منزلِ مقصود، کل سے دور ہو

طاہرہ کے نام خطوط

پرویز صاحب کے خطوط کا سلسلہ ہماری تعلیم یافتہ نئی نسل میں بڑا مقبول ہوا ہے اور ان کے قلب و دماغ میں جو صحیح انقلاب آیا ہے اس کا بیشتر انہی خطوط کا رہینِ منت ہے۔ سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) نوجوان طلباء کے نام ہیں اور طاہرہ کے نام، طالبات کے لئے جس میں بالخصوص عورتوں سے متعلق مباحث کو قرآن مجید اور علومِ حاضرہ کی روشنی میں سمجھایا گیا ہے۔ یہ سلسلہ خواتین کے حلقہ میں بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور انہوں نے اسے بڑا مفید پایا ہے۔ ــــ قیمت -/۱۰ روپے علاوہ محصول ڈاک۔ ...... ملنے کا پتہ:-

(۱) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

(۲) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے:-

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف : (نوٹ: پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپ بزموں کے لئے ریکارڈ کرلئے جاتے ہیں۔)
لاہور	ہر جمعہ ½9 بجے صبح	۲۵-بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ½ بجے صبح	76. PARK ROAD, ILFORD, TELEPHONE NO 553-1896
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	بذریعہ وی سی آر، 335 DRIFT WOOD AVE: #311, DOWNS VIEW, TORONTO (ONT.) M 3N-2P3, TEL: (416)661-2827
پشاور	۱- ہر جمعہ ۵ بجے شام ۲- ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب رفیقی نائب صدر (بالمقابل VIP MAINGATE PESHAWAR STADIUM) شیریں محل B.3 یونیورسٹی ٹاؤن، بازہ روڈ فون: ۴۲۴۵۹
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف ـ محمود علی صاحب ـ اتمانخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی-۱۴۴ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینکل انجینئرنگ ورکس ـ شہید روڈ لیہ
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی، مکان ۳۸ ـ نظامی منزل
فیصل آباد	ہر جمعہ ½3 بجے شام	بمقام ـ جہانت سرجری کلینک، ۲۳/ پیپلز کالونی ۱ نمبر فون: ۴۲۸۵۵
ہنگو	ہر جمعہ ½5 بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ ـ فون: (۶۷)
پنجکسی تحصیل کبیروالہ (ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام: مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ملتان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر میسرز شاہ سنز بیرون پاک گیٹ ـ فون: (۲۱۰۷۱)
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ ـ عثمان پورہ، باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خاں صاحب
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے: ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر ـ ترنگی روڈ ـ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم و ملحق رہائش گاہ: چودھری مقبول شوکت صاحب ـ گل روڈ (رسول لائن)
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ اور ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۱۲۰/۱-بی ـ کچہری روڈ ـ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ایبٹ آباد	۱- ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر ۲- ہر اتوار ۳ بجے سہ پہر	رہائش گاہ: صلاح الدین صاحب ـ واقع: L-K-234 ـ کیہال (ایبٹ آباد) " غلام مصطفےٰ اعوان صاحب واقع K-356 ـ کنج گراؤنڈ (ایبٹ آباد)

محترم پرویز صاحب
کے
درسِ قرآن
بذریعہ
VCR
کے

کوائف اوقات و مقام
متعلقہ
بزم ہائے
طلوع اسلام

کراچی (پاکستان)

ہر جمعہ ۹½ بجے صبح
دارالذہرہ بالائی منزل
بالمقابل سٹاپ بس نمبر ۲۰
سرمد روڈ (کراچی صدر)

گجرات (پاکستان)

ہر جمعرات ۳ بجے سہ پہر
رہائش گاہ: ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب
جناح کالونی ٹیلیفون:
(گجرات) ۳۶۳۰
۳۷۴۰

اوسلو (ناروے)

PHONE
184325

ہر اتوار
شام ۴ بجے بمقام

MR MANZOOR AHMAD
DOVRE GATE – 7/OSLO – 1

برمنگھم (انگلینڈ)

ہر ماہ کا پہلا اتوار
۲ بجے دوپہر

227/229 ALUM ROCK ROAD
38.3BH (BIRMINGHAM)

فریڈرک سٹاڈ (ناروے)

PHONE
10287

ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا اتوار
شام ۴ بجے بمقام

MR BASHIR (BATALVI)
ARIVE – SVENDSENS. G.T. 1
1600 FREDRIK STAD (NORWAY)